مطبوعات سیاست سلسلہ (۲۷)

پروفیسر نثار احمد فاروقی

(روزنامہ سیاست میں مطبوعہ مضامین سے)

صوفیائے کرام

اور

قومی یکجہتی

پروفیسر نثار احمد فاروقی

(روزنامہ "سیاست" میں مطبوعہ مضامین سے)

اشاعت : اپریل 1997

کمپوزنگ : سیاست کمپیوٹر سیکشن

طباعت : اِنتخاب پریس

قیمت : -/25

ناشر : ادارہ روزنامہ سیاست

جواہر لال نہرو روڈ، حیدر آباد۔ 500 001

ملنے کے پتے :

- سیل کاؤنٹر روزنامہ سیاست حیدر آباد
- حسامی بک ڈپو، مچھلی کمان، حیدر آباد

فہرست

پیش لفظ

روزنامہ "**سیاست**" نے پچھلی پانچ دہائیوں میں سماجی، ادبی، ثقافتی، مذہبی، علمی اور دیگر موضوعات پر ایسے مضامین شائع کئے ہیں جن کی اہمیت مسلمہ اور جن کی افادیت دیرپا ہے۔ والد مرحوم جناب عابد علی خاں، بانی ایڈیٹر "**سیاست**" نے کچھ برس پہلے ان مضامین کی اہمیت کے پیش نظر، جو سیاست کے ہزاروں صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ کیا کہ ان مضامین کو منتخب کر کے کتابی شکل میں شائع کیا جائے۔ اسطرح "مطبوعات سیاست" کی اشاعت کا آغاز ہوا جس کے تحت اب تک چھبیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں جنھیں علمی اور ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا۔ بعض کتابوں کے اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب "صوفیائے کرام اور قومی یکجہتی" اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ "**سیاست**" نے مختلف موقعوں پر صوفیائے کرام کے بارے میں ملک کے کئی اہلِ قلم حضرات اور علمائے دین سے مضامین لکھوائے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی، صدر شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی '**سیاست**' کے پرانے لکھنے والوں میں ہیں جن کے سینکڑوں مضامین "**سیاست**" میں شائع ہو چکے ہیں۔ وہ ایک ممتاز دانشور، جیدّ عالم، محقق اور نقاد ہیں۔ ادبی موضوعات کے علاوہ دینی اور مذہبی امور پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ تصوف اور ویدانت کے فلسفہ پر بھی وہ بے پناہ دسترس رکھتے ہیں۔ ہندوستان کے صوفیائے کرام نے کئی صدیوں پہلے ایک نئے سماجی ڈھانچہ کی تشکیل کی جس کی بنیاد انسان دوستی، محبت، یگانگت اور یکجہتی پر رکھی گئی تھی۔ حکمران، باشندوں پر حکومت کرتے تھے لیکن صوفیائے کرام عوام کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ آج بھی ہمارے معاشرہ میں جو یگانگت اور رواداری نظر آتی ہے وہ ان ہی صوفیائے کرام کی تعلیمات کا فیض ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ بدلے ہوئے حالات میں ان بزرگانِ دین کی تعلیمات کو از سر نو سمجھا جائے اور اُنھیں دوبارہ ہمارے معاشرہ میں رائج کرنے کی سعی کی جائے۔ یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو علمی اور ادبی حلقوں میں سراہا جائیگا اور اسکی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔

زاہد علی خاں

حضرت خواجہ معین الدین سنجری اجمیریؒ
تاریخ کی روشنی میں

ہندوستان میں تصوف کے دو خانوادوں نے سب سے پہلے نفوذ کیا۔ سہروردی سلسلہ مغربی علاقوں میں خاصا مقبول ہوچکا تھا اور اس کے مبلغین شمالی ہندوستان کی طرف بھی بڑھتے آرہے تھے لیکن چشتیہ سلسلے کا فروغ حضرت خواجہ معین الدین سنجری علیہ الرحمہ کے قدوم میمنت لزوم کے ساتھ ہوا اور آپ نے مغربی سرحدوں سے آگے بڑھ کر ہندوستان کے قلب میں اپنے مشن کی تبلیغ کی اور اجمیر کو ہمیشہ کیلئے روحانیوں کا قبلہ وکعبہ بنادیا۔

سہروردی سلسلے کے بانی حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی سے چشتی کے سلسلے کے بزرگوں نے بھی فیض حاصل کیا۔ اور ان کی بلند پایہ تصنیف عوارف المعارف تو کہنا چاہیے کہ اہل تصوف کی رہنما کتاب تھی اور یہ ان چند کتابوں میں سے ایک ہے جن میں ایک تو قرآن و سنت کی روشنی میں یہ ثابت کیا گیا ہیکہ تصوف محض عجمی اور غیراسلامی چیز نہیں ہے بلکہ یہ دین کی روح کا نام ہے۔ دوسرے اس کے تمام نظری مباحث پر پوری وضاحت سے لکھا گیا ہے۔ علمائے ظاہر نے اہل تصوف کے خلاف جو محاذ تیار کیا تھا اسے عوارف المعارف اور کشف المحجوب جیسی کتابوں نے بیت عنکبوت سے زیادہ کمزور بنادیا ہے اور لے دے کر صرف ایک سماع کا مسئلہ ایسا رہ گیا تھا جس پر وہ "محضر" تیار کرسکتے تھے۔ سہروردی بزرگوں نے تصوف کے نظری مباحث پر خوب خوب لکھا اور یہ سلسلہ بعد میں کئی صدیوں تک جاری رہا لیکن چشتیہ سلسلے کی مقبولیت کے دو بڑے اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ چشتی بزرگوں نے حاکمان وقت سے اپنے روابط نہیں رکھے بلکہ عوام کے پس ماندہ طبقوں سے گہرا تعلق قائم کیا۔ سلاطین تغلق کے زمانے تک سہروردی سلسلے کے بزرگوں کو قصر سلطانی میں اتنا رسوخ حاصل تھا کہ وہ نہ صرف حاجت مندوں کی عرضیاں لے کر بادشاہ کو پیش کرتے تھے بلکہ حضرت رکن الدین ملتانیؒ نے اپنا رسوخ استعمال کرکے محمد تغلق کے ہاتھوں ملتان کو قتل عام سے بچالیا تھا۔ مگر چشتیہ سلسلے کے بزرگ اس کے برعکس ان پریشان حال درماندہ اور حاجت مندوں کیلئے دعا اور تعویذ ہی پر قناعت کرتے تھے۔ اس کی نوبت تقریباً نہیں آتی تھی کہ وہ کسی کیلئے بادشاہ وقت

سے سفارش بھی کریں۔ اس طرح ابتداء میں اس خانوادے کے بزرگوں نے تصنیف و تالیف سے احتراز کیا چنانچہ اگر حضرت نظام الدین نے یہ فرمایا کہ "ہمارے مشائخ میں سے کسی نے کوئی کتاب نہیں لکھی"۔

تو اس کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہیکہ چشتی بزرگوں نے تصوف کے نظریاتی مباحث پر ایسی کوئی تصنیف نہیں چھوڑی جیسی مرصادالعباد۔ قوت القلوب، کشف المحجوب، التعرف۔ عوارف المعارف یا آداب المریدین وغیرہ ہیں اور اس کا سبب یہ ہیکہ چشتی بزرگوں نے تصوف کو سراسر "حال" سمجھا اور اس میں "قال" کو دخل نہیں دیا۔ وہ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تصوف تمام تر عمل ہے اس کا فلسفے کی طرح شرح و بیان میں آنا مشکل ہے اور جو کچھ قید الفاظ میں آئے گا وہ "تصوف" نہیں ہوگا۔ عبدالرحیم خان خاناں کا دوہا اسی مضمون کا ہے۔

رحیمن بات آگم کی کہن سنن کی ناہیں

جانت ہیں سوکہت نہیں، کہت سو جانت ناہیں

اور حضرات چشتیہ کے اس نظریئے کو شیخ سعدی شیرازی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

اے مرغ سحر عشق ز پروانہ بیاموز   کاں سوختہ را جاں شد و آواز نیامد

ایں مدعیان در طلبش بے خبرانند   آں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد

اس لیے چشتی سلسلے کے بزرگوں نے تصوف کی نظری صورت کو چھوڑ کر اس کی عملی شکل پر اپنی توجہ مرکوز رکھی اور انھیں اپنا پیغام عام کرنے میں جو کچھ کامیابی نصیب ہوئی اس کا راز بھی یہی تھا۔

فوائدالفواد میں ہیکہ ایک دن ایک نوجوان اپنے ساتھ اپنے ایک ہندو دوست کو لے کر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں آیا اور اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "ایں برادر من است"۔ حضرت نے اس نوجوان سے پوچھا کہ "تمہارے اس بھائی کو کچھ اسلام کی طرف بھی رغبت ہے یا نہیں؟"

اس نے کہا میں اسے مخدوم کی خدمت میں لے کر اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کی نگاہ کی برکت سے یہ مسلمان ہو جائے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی آنکھیں نم ہو گئیں اور فرمایا:

" این قوم راچنداں بگفتہ ...... کسے دل نگردد ، اگر صحبت صالح بیابد امید باشد کہ ببرکت صحبت او مسلماں شود "۔

(اس قوم پر کسی کے کہنے سننے کا اثر نہیں ہوتا ، ہاں اگر کسی صالح کی صحبت نصیب ہوجاتی ہے تو امید ہوتی ہیکہ اس کی برکت سے مسلمان ہوجائے)۔

یہ واقعہ فوائد الفواد میں 4/ رمضان 717 ہجری کی مجلس کے بیان کے ضمن میں آگیا ہے لیکن یہ چشتی صوفیہ کے مشن کو سمجھنے کیلئے بے حد اہم اور قابل غور نکتہ ہے ۔ خود حضرت کا سوال کرنا کہ " ایں برادر تو ہیچ میل بہ مسلمانی دارد ؟ دعوت حق سے گہرے قلبی تعلق کو ظاہر کرتا ہے اور جب اس لڑکے نے دعا کی درخواست کی تو آپ کا " چشم پرآب " ہوجانا قرآن کے اس فرمان کی نہایت گہری اور اصلی عملی ترجمانی ہیکہ

ولتکن منکم امة یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولیک ھم المفلحون (پارہ ۴ آیت ۱۰۴)

اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہیکہ دعوت اسلام کی روح کو ان بزرگوں نے کیسا سمجھا تھا۔ حدیث شریف میں ہیکہ " الدین النصحیة " دین خیر خواہی کا نام ہے اور یہی وہ سچی خیر خواہی ہے جو حضرت نظام الدین کو اس موقع پر چشم پرآب کردیتی ہے ۔ آپ نے تبلیغ دین کا اصول بھی بتادیا کہ جس " خیر " کی طرف تم کسی کو بلارہے ہو اس کا نمونہ خود بن کر دکھاؤ ۔ تب دعوت الی الخیر کا حق ادا ہوگا۔ قرون وسطی میں علمائے سوء کا کردار کچھ بھی رہا ہو لیکن جو صاحب کردار علمائے شرع تھے انھوں نے بھی خوب سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان میں دعوت دین کیلئے " تصوف " کی ضرورت ہے ۔ بحث و مناظرے کی نہیں۔

حضرت خواجہ غریب نواز کے ہم عصر مولانا رضی الدین صغانی صاحب مشارق الانوار بہت ممتاز محدث اور عالم تھے ۔ ان کے ہم عصر علماء میں کوئی بھی علم حدیث اور فقہ میں ان کا ہم پایہ نہ تھا وہ ان معدودے چند علماء میں سے تھے جنھوں نے اس زمانے میں بغداد اور حجاز پہنچ کر حدیث کی سماعت کی تھی ۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے فوائد الفواد میں ان کی تعریف میں بہت کچھ فرمایا ہے ۔ ان کی تالیف مشارق الانوار آج بھی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور حدیث کی مستند کتابوں میں شمار ہوتی ہے ۔ علامہ

صنعانی کی ایک اور تالیف مصباح الدجی بھی تھی۔ چنانچہ جب مولانا ناگور پہونچے ہیں تو انھوں نے ایک محفل میں اور ایک ہی نشست میں پوری مصباح الدجی کی قراءت کی تھی اور سماعت کرنے والوں کا بڑا بھاری مجمع تھا جس میں قاضی حمید الدین ناگوری اور قاضی کمال الدین جیسے فضلاء بھی استفادے کیلئے موجود تھے۔ مولانا صنعانی خوب بڑی سی پگڑی باندھتے تھے جس کی چھور آگے کی طرف لٹکی ہوتی تھی۔ بہت لمبی چوڑی آستینوں کا کرتا ہوتا تھا۔ یہ اس زمانے کے علماء کی ہئیت تھی۔ یہیں ناگور کے ایک صاحب نے مولانا سے بہت اصرار کیا کہ میں آپ سے کچھ "علم تصوف" سیکھنا چاہتا ہوں۔ مولانا نے کہا کہ یہاں تو مجھے بالکل فرصت نہیں ہے لوگ حدیث کی سماعت کیلئے جمع ہوتے ہیں اور اتنا وقت نہیں بچتا کہ تمھیں علم تصوف سکھاؤں۔ البتہ اگر تمھیں ایسی ہی خواہش ہے تو میرے ساتھ چلو۔ جب ہم غیر مسلموں کے علاقے میں پہونچیں گے جہاں علم حدیث اور فقہ کے طلب گاروں کا اتنا ہجوم نہیں ہوگا تو میں تمھیں اطمینان سے علم تصوف سکھاؤں گا چنانچہ مولانا اور یہ تصوف کے طالب علم لکھے اور ناگور سے جالور کی طرف راہی ہوئے۔ گجرات کی سرحد کے شروع ہوتے ہی مولانا اپنا لمبی آستینوں والا کرتا اور بڑی پگڑی لپیٹ کر ایک بقچے میں رکھی اور کوتاہ آستینوں کا درویشوں والا لباس زیب تن کیا۔ سر پر کلاہ۔ پاؤں میں جوتے کی جگہ کھڑاویں آگئیں۔ ایک مٹی کا آبخورہ پانی پینے کیلئے لے لیا اور نماز و نوافل پڑھتے ہوئے سفر کی منزلیں طے کرنے لگے۔ جب اس طرح کئی دن گذر گئے تو اس طالب علم تصوف نے کہا کہ مولانا آپ نے فرمایا تھا کہ مجھے کچھ علم تصوف سکھائیں گے اور اس امید پر میں گھر بار چھوڑ کر آپ کے ساتھ لگ گیا ہوں مگر آج اتنے دن ہوگئے آپ نے ایک بات بھی نہیں سکھائی۔ مولانا فرمانے لگے میاں علم تصوف "قال" نہیں ہے "حال" ہے جیسے میں عبادت کررہا ہوں اور عام لوگوں سے برتاؤ کررہا ہوں بس ویسے ہی تم بھی کیے جاؤ۔ یہی علم تصوف کہلاتا ہے۔

مولانا صنعانی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم اور محدث ہوئے ہیں اس دور کے جید علماء ان کی صحبت سے استفادہ کرتے تھے لیکن وہ بھی یہ نکتہ اچھی طرح سمجھے ہوئے تھے کہ:۔
منقولی بحثیں، یہ مناظرے اور مکابرے، یہ فلسفہ اور منطق یہ مسئلے اور تاویلیں صرف اسلام کے ظاہر کو پیش کرسکتی ہیں۔ اس کی روح کو اور بھی خفی اور بے اثر بنادیتی ہیں۔ اسلام کی اصلی تعلیم وہی ہے جسے صوفیہ اپنے عمل سے پیش کررہے ہیں اور اسی نے ہندوستان میں اسلام کو فروغ دیا اور دلوں کو جوڑنے

کا کام کیا ہے ۔ چنانچہ مولانا صنعانی بھی جب غیر مسلم اکثریت کے علاقے میں جاتے ہیں تو صوفیہ کا لباس زیب تن کرلیتے ہیں اور اپنا چوغا تہ کرکے رکھ دیتے ہیں ۔

اس مقدمے میں دو باتیں واضح ہوگئیں ۔ ایک تو یہ کہ سہروردی سلسلے کے بزرگوں نے تصوف کی نظری سطح پر تشریح و تفسیر کی اور اس کے علمی اور فلسفیانہ پہلوؤں پر کتابیں تصنیف کیں جن سے دوسرے سلسلے والوں نے بھی فائدہ اٹھایا مگر اپنے خانقاہی نظام عمل میں انھوں نے دین اور دنیا کے جام و سندان کو ایک توازن کے ساتھ یک جا رکھنا چاہا اور حاکمان وقت پر بھی اثر انداز ہونے کی کوشش کی ۔ اس لیے ان کی خانقاہیں زمان و مکان کے اعتبار سے محدود ہو کر رہ گئیں جب کہ چشتیوں کی خانقاہیں چھوٹے چھوٹے دیہات و قصبات تک میں پہنچ گئیں اور عوام کے دلوں میں ان کیلئے گھر بن گئے ۔ اس دین و دنیا کی آمیزش سے پیدا ہونے والے تضاد کو ابتداء ہی میں محسوس کرکے چشتی صوفیہ نے "ترک" کے فلسفے پر زور دیا اور اپنے مریدوں کو اس کی تربیت دینے کیلئے "چہار ترکی" کلاہ پہنانی شروع کردی ۔ ان کا کہنا تھا کہ

"مرد عالی ہمت نشود تا ترک دنیا نگیرد" ۔

اور اس "ترک" کا پھل یہ تھا کہ جب دہلی کے شیخ الاسلام کو حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی سے حسد ہونے لگا اور اس کی شکایت پر حضرت خواجہ غریب نواز نے یہ فرمایا کہ : "قطب الدین تم میرے ساتھ اجمیر چلو میں نہیں چاہتا کہ میرے کسی جانشین کی وجہ سے کسی کو تکلیف پہونچے" ۔

اور حضرت بختیار کاکی اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل میں دہلی کو خیرباد کہہ کر جانے لگے تو آپ کو رخصت کرنے کیلئے ہزارہا مرد ، عورتیں ، بوڑھے اور بچے گریہ وزاری کرتے ہوئے آپ کے پیچھے پیچھے شہر پناہ سے باہر تک نکل آئے ۔ اس ہجوم میں بوڑھا بادشاہ التمش بھی موجود تھا ۔ سب کی یہ حالت دیکھ کر حضرت خواجہ بزرگ نے قطب صاحب کو اپنے ساتھ اجمیر لے جانے کا ارادہ فسخ کردیا ۔

یہ واقعہ بہت مشہور ہے اور کتب تواریخ میں چشتی حضرات کے عوام سے براہ راست رابطے کی سب سے قدیم اور بدیہی مثال یہی ہے ۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہیکہ یہ بزرگ خانقاہوں میں بیٹھ کر محض

انفرادی نجات کے حصول کی کوشش نہیں کر رہے تھے بلکہ انھوں نے اپنے عہد کے سماجی مسائل سے خود کو بہت گہرائی تک وابستہ کرلیا تھا۔ انھوں نے ملوک و سلاطین اور سرکار دربار کو کبھی منہ نہیں لگایا۔ نہ کبھی دنیا کی دولت حاصل کرنے کی کوشش کی اور وہ آئی بھی تو اسے جمع کرکے نہیں رکھا۔ اس طرح اپنی عملی زندگی سے یہ ثابت کردیا کہ دراصل فقر بھی ایک عظیم دولت ہے۔

وہ غریبوں، مسکینوں، درماندہ حال اور پس ماندہ طبقے کے انسانوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کی سچی متابعت کرتے تھے۔ ان کی دعا یہ ہوتی تھی اَللّٰھُمَّ اَحینیِ مسکینا و اَمِتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین ۔ غریبوں اور مسکینوں سے سچی محبت کی مثال اس سے زیادہ کیا ہوسکتی ہے کہ اپنی زندگی اور موت اور حشر و نشر بھی ان کے ساتھ طلب کیا جائے چشتی بزرگوں کی خانقاہوں میں ہمیشہ مفلسوں اور مسکینوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

حضرت نظام الدین اولیاء جب بارہ تیرہ برس کے ہی تھے اور بدایوں میں علم لغت پڑھ رہے تھے اس وقت ایک قوال نے جس کا نام ابوبکر خراط تھا۔ ان کے استاد کے سامنے بہت سی ان خانقاہوں اور درویشوں کا تذکرہ کیا جہاں وہ حاضری دے چکا تھا۔ اس نے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی علیہ الرحمہ کی خانقاہ کا تذکرہ کیا تو اس کے ساتھ ان کی دولت مندی اور خدم و حشم کا ذکر ہونا لازمی تھا۔ حضرت نظام الدین نے اس سے کوئی اثر قبول نہیں کیا مگر حضرت بابا فرید کے فقر محض کا حال سن کر انھیں خاص کیفیت کا احساس ہوا اور انھوں نے اسی وقت یہ طے کرلیا تھا کہ کبھی نہ کبھی شیخ کی خانقاہ میں حاضری دیں گے۔ ان کی طبعی کشش بھی دراصل چشتی فقر کی طرف تھی جس کی ترویج کیلئے آگے چل کر آپ کو اپنی زندگی وقف کرنا تھی۔ بقول خود ان کے پیر و مرشد حضرت بابا فرید کا یہ حال تھا کہ " دونوں عالم نظر میں ہیچ تھے "۔

ایک بار عصا لے کر چل رہے تھے اس پر تکیہ کرنے کا خیال آیا تو فوراً ہاتھ سے پھینک دیا اور ان کے یہ مرید بھی ایسے تھے کہ جب انھوں نے کسی سے سنا کر حضرت بہاء الدین زکریا نے اپنے بیٹے شیخ رکن الدین کو کوئی خاص وظیفہ تعلیم کیا تھا تو آپ کو بہت دنوں تک یہ فکر رہی کہ کسی طرح وہ وظیفہ معلوم ہوجائے۔ بارے جب شیخ رکن الدین ملتانی سے ملاقات ہوئی تو آپ نے وہ وظیفہ

حضرت نظام الدین کو بھی بتا دیا۔ آپ نے دیکھا کہ اس میں ایک جگہ لفظ ۔۔ "یا مسبب الاسباب" بھی آتا ہے۔ بس یہ اسباب" کا نام دیکھ کر طبیعت نے ابا کیا اور جس دعاء کے حصول کیلئے آپ برسوں منتظر رہے تھے۔ جب وہ مل گئی تو اسے کبھی ایک بار بھی نہیں پڑھا۔

چشتی سلسلے کے ممتاز بزرگوں میں حضرت بابا فرید اور حضرت نظام الدین اولیاء کے کچھ حالات اور واقعات ہمیں مل جاتے ہیں جن سے چشتی خانقاہوں کے نظام اور بزرگوں کی تعلیمات کا اندازہ ہوتا ہے لیکن حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں تاریخ اور تذکرے ہمیں بہت ہی کم معلومات فراہم کرتے ہیں اور بعد کے زمانے میں کچھ روایات کے اضافوں نے اس تھوڑے سے تاریخی مواد کو بھی مبہم بنادیا۔

پروفیسر محمد حبیب مرحوم نے اپنے ایک مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہیکہ خواجہ صاحب کے حالات میں قدیم ترین کتاب سیرالاولیاء ہے جو حضرت خواجہ اجمیری کے وصال سے تقریبا سوا سو برس کے بعد مرتب ہوئی ہے ۔ اس میں جو معلومات درج ہیں ان پر کچھ اضافہ شیخ جمالی دہلوی مؤلف سیرالعارفین نے کیاہے جو سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے اور عہد ہمایوں بادشاہ میں سیر و سیاحت کرنے بھی نکلے تھے۔ وہ خواجہ بزرگ کے وطن اصلی سیستان بھی پہونچے تھے اور انھوں نے حضرت خواجہ اور آپ کے خاندان وغیرہ کے بارے میں کچھ مواد وہاں کی مقامی روایتوں سے بھی فراہم کیا ہوگا لیکن بہ حیثیت مورخ پروفیسر محمد حبیب کا یہ خیال صحیح ہیکہ خواجہ بزرگ اور شیخ جمالی دہلوی کے عہد میں تقریبا تین صدیاں حائل ہیں اور یہ بات بہت ہی مستبعد اور مشتبہ ہیکہ شیخ جمالی کو اتنا زمانہ گزرنے کے بعد بھی سیستان میں کچھ ایسے معتبر رواہ مل سکے ہوں جو خواجہ بزرگ کے بارے میں کچھ مستند معلومات فراہم کرسکتے ہوں۔

خواجہ بزرگ کے جو حالات اب ہمیں معلوم ہیں اور متداول تذکروں میں ملتے ہیں ان میں شیخ جمالی کے سفر سیستان وغیرہ کی "رہ آورد" کیا ہے؟ اور اس کا استناد کس درجے کا ہے؟ یہ ایک علحدہ تحقیق کا موضوع ہے۔ لیکن مجھے سردست صرف یہ عرض کرنا ہیکہ پروفیسر محمد حبیب کی اس رائے میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ جہاں تک خواجہ صاحب کے بارے میں تاریخی شہادتوں کا سوال ہے۔ عہد وسطی کے بعض مورخوں کی رائے میں آپ کا تذکرہ سب سے پہلے طبقات ناصری میں پایا جاتا ہے

جو 658 ہجری 1262ء کی تصنیف ہے۔ اس کے مصنف قاضی منہاج سراج جوزجانی 589 ہجری 1193ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اور اجمیر۔ سوالک۔ ہانسی۔ سرسی وغیرہ علاقے رائے پتھورا کی شکست کے بعد 588 ہجری 1192ء میں فتح ہوئے تھے اس سے اگلے سال 589 ہجری میں قطب الدین ایبک نے پہلے میرٹھ۔ پھر دہلی کو فتح کیا تھا۔ 621 ہجری 1249ء میں وہ ایک سفارت لے کر قہتسان گئے تھے اور وہاں سے واپس آنے کے بعد 624 ہجری میں مدرسہ فیروزی اوچھ کے نگراں مدرس بنادئے گئے تھے۔ وہ 625 ہجری میں التمش کے لشکر کے ساتھ دہلی آگئے تھے اس لیے اگر خواجہ بزرگ سے ان کی ملاقات ہوئی تو اس کا زمانہ 625 ہجری اور 633 ہجری کے درمیان آٹھ سال کا عرصہ ہوسکتا ہے جب وہ لشکر شاہی میں شامل ہو کر ہندوستان کے مختلف علاقوں میں گھوم رہے تھے تو انھوں نے خواجہ بزرگ سے اپنی ملاقات کا حال واضح اور راست انداز میں کہیں نہیں لکھا ہے جہاں رائے پتھورا کی شکست کا ذکر ہے اس موقعے پر کہتے ہیں:

"ایں داعی از ثقہ شنید کہ از معارف جبال بلاد تولک بود۔ لقب او معین الدین اوشی گفت کہ من دراں لشکر باسلطان غازی بودم عدد سوار لشکر اسلام دراں وقت صد و بست ہزار برگستواں بود"۔

طبقات ناصری کے اس حوالے کا بھی گہرا تجزیہ کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ ماننے میں بہت تامل ہیکہ یہ بیان حضرت خواجہ بزرگ کے بارے میں ہوسکتا ہے۔ یہ درست ہیکہ اکثر فاتحین نے اپنے لشکر کے ساتھ چشتی بزرگوں کو برائے حصول برکت شریک سفر رکھا ہے اور یہ بزرگ زمین یا خزانوں کے لالچ میں نہیں بلکہ تبلیغ دین اور حمایت شرح مبین کے جذبے کے ساتھ اس لشکر کشی میں شامل ہوتے تھے۔ خواجہ بزرگ بھی اس وقت ہندوستان میں تھے اور شہاب الدین غوری اپنی ہر مہم میں کچھ درویشوں۔ بزرگوں اور عالموں کو ساتھ لے کر نکلتا تھا۔ چنانچہ علی گڑھ کی مہم میں شیخ شہاب الدین سہروردی کے بھانجے نور الدین مبارک غزنوی اور ان کے بھانجے حضرت نظام الدین ابوالمؤید اس کے ساتھ تھے اور فتح کے بعد اس علاقے کی قضاء ان کے خاندان کے حوالے کی گئی تھی اجمیر کی مہم میں خواجہ بزرگ کی روحانیت نے جو مدد کی اس کا حوالہ سینہ بہ سینہ چلنے والی روایات میں بھی آتا ہے لیکن یہاں منہاج سراج نے جس انداز سے تذکرہ کیا ہے اسے دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہیکہ خواجہ بزرگ کی سی عظیم

شخصیت کا ایسا سرسری حوالہ نہیں ہوسکتا کہ صرف "ازثقہ شنیدم" کہہ کر گذر جائیں۔

اگر طبقات ناصری کے اس بیان کو خواجہ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو پھر آپ کا قدیم ترین حوالہ حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات میں ملتا ہے۔ فوائد الفواد میں حضرت خواجہ معین الدین حسن سنجری علیہ الرحمہ کا نام مبارک صرف تین مقامات پر آیا ہے وہ بھی براہ راست نہیں بلکہ ضمناً ہے۔

15/ محرم 710 ہجری کی مجلس میں تذکرہ تھا کہ سلامتی ایمان کی کیا علامت ہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے حاضرین سے فرمایا کہ نگاہ داشت ایمان کیلئے نماز مغرب کے بعد دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر ان کی ترکیب بیان فرما کر یہ واقعہ سنایا کہ:

"میں نے شیخ معین الدین حسن سنجری قدس اللہ سرہ العزیز کے پوتے خواجہ احمد کی زبانی سنا اور یہ خواجہ احمد بہت ہی صالح تھے انھوں نے کہا کہ میرا ایک ساتھی تھا سپاہی۔ وہ ہمیشہ یہ دو نفل حفظ ایمان کیلئے پڑھا کرتا تھا حتیٰ کہ ایک بار ہم لوگ حدود اجمیر میں تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت آگیا اس علاقے میں رہزنوں کا بہت اندیشہ تھا اور ڈاکو دور سے نظر بھی آنے لگے ہم نے جلدی جلدی تین فرض اور دو سنتیں پڑھیں اور شہر کی طرف آگئے وہ ساتھی باوجود اس کے کہ رہزن نمودار ہوگئے تھے۔ یہ نفل پڑھنے میں مشغول ہوگیا۔ پھر جب اس دوست کے انتقال کا وقت آیا تو میں تفحص احوال کیلئے اس کی تربت پر آیا تو دیکھا کہ جس شان سے اسے دنیا سے جانا چاہیے تھا اسی طرح گیا ہے۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ خواجہ احمد تو اس جوان کے انتقال کا قصہ سنا کر یہ کہتے تھے اگر مجھے گواہی کیلئے کرسی قضا کے سامنے لے جائیں تو میں گواہی دوں گا کہ وہ باایمان گیا ہے"۔

دوسرے موقع پر 21/ ذی قعدہ 718 ہجری کی مجلس میں شیخ حمید الدین سوالی کے بیان میں یہ فرمایا کہ۔

"مرید شیخ معین الدین بود ہم خرقہ شیخ قطب الدین"۔

تیسرا حوالہ 5/ رمضان 720 ہجری کی مجلس میں اس طرح ہیکہ

"حضرت شیخ معین الدین سنجری رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے خواجہ وحید الدین اجودھن میں

حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں آئے اور ان سے بیعت کرنے کی خواہش ظاہر کی، بابا صاحب نے فرمایا کہ مجھے یہ نعمت آپ کے ہی خاندان سے ملی ہے۔ میرے لیے یہ مناسب نہیں ہیکہ آپ کو بیعت کروں مگر انھوں نے بہت اصرار و الحاح کیا کہ مجھے تو آپ سے ہی مرید ہونا ہے تو بابا صاحب نے دست بیعت بڑھا دیا۔"

ان تین حوالوں کے سوا، خواجہ بزرگ کے نام فوائد الفواد میں اور کہیں نہیں آیا اور ان میں بھی آپ کے دو پوتوں خواجہ احمد اور خواجہ وحید الدین علیہما الرحمہ کا تذکرہ ہے خود خواجہ صاحب کا نہیں۔ اگر منہاج سراج والے حوالے کو خواجہ بزرگ کے بارے میں نہ مانا جائے تو فوائد الفواد وہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں خواجہ بزرگ کا اسم مبارک پہلی بار 710 ہجری کی مجلس میں ملتا ہے۔ اگر فوائد الفواد کے ان حوالوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ حضرت خواجہ سے براہ راست متعلق نہیں ہیں بلکہ آپ کے پوتوں کے تذکرے میں ضمناً آپ کا نام مبارک آیا ہے تو پھر معلوم اور موجود ماخذ میں سیر اولالیاء ہی وہ قدیم ترین کتاب رہ جاتی ہے جس میں حضرت خواجہ بزرگ کا تذکرہ ملتا ہے۔ سیر الاولیاء سے معلوم ہوتا ہیکہ حضرت خواجہ بزرگ بیس سال تک سفر و حضر میں اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ عثمان ہرونی کے ساتھ رہے تھے۔ اس کتاب سے آپ کا بغداد اور حجاز کا سفر کرنا اور حج بیت اللہ سے مشرف ہونا بھی دریافت ہوتا ہے حالانکہ حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ میں سے کسی نے حج نہیں کیا۔ مؤلف سیر الاولیاء نے حضرت خواجہ بزرگ کی چند کرامتیں بھی لکھی ہیں جن کا دوسرے تذکرہ نگاروں کے یہاں بھی اعادہ ہوا ہے لیکن امیر خورد نے سب سے اہم بات یہ لکھی ہیکہ۔

"آپ کی کرامات اور علوے درجات کے ثبوت میں اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہیکہ خواجہ بزرگ کے سلسلے سے وابستہ ہونے والے ایسے عظیم المرتبت انسان ہوئے ہیں اور انھوں نے بندگان خدا کی ایسی دستگیری کی ہے کہ انھیں دنیا کے مکر و فریب سے بچایا ہے اور قیام قیامت تک ان کی عظمت کا غلغلہ فلک و ملک کے کانوں میں گونجتا رہے گا اور ان سے محبت کرنے والی مخلوق کو اس محبت کے طفیل، مقعد صدق میں جگہ ملتی رہے گی۔ پھر مؤلف کہتا ہے کہ اس آفتاب اہل یقین نے ہندوستان کو نور اسلام سے ایسا

منور کردیا ہے کہ آپ کی تعلیم و تبلیغ کی بدولت جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی اولاد میں جب تک سلسلہ ایمان و اسلام کا جاری رہے گا اس کا اجر و ثواب آپ کی بارگاہ باجاہ میں پہونچتا رہے گا۔

سیرالاولیاء نے آپ کے کچھ ملفوظات بھی درج کیے ہیں۔ خواجہ بزرگ نے فرمایا کہ حق کو پہچاننے کی علامت خلق سے کنارہ کشی ہے اور معرفت میں خاموش رہنا ہے۔ اور فرمایا کہ جب ہم نے عالم ظاہر سے نکل کر نگاہ کی تو عاشق و معشوق کو ایک ہی پایا یعنی عالم توحید میں وحدت ہی وحدت ہے۔ اور فرمایا کہ حاجی اپنے جسم (قالب) سے خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہیں مگر جو عارف ہیں وہ اپنے دل (قلب) سے عرش اور حجاب عظمت کے گرد طواف کرتے ہیں اور رب کعبہ کی رویت کے طالب ہوتے ہیں۔

اور فرمایا شقاوت کی نشانی یہ ہےکہ گناہ کرے اور پھر بھی مقبولیت کی امید رکھے فرمایا کہ قیامت کے دن خداوند تعالی فرشتوں کو فرمان دے گا کہ دوزخ کو دہانِ مار سے باہر نکالیں۔ پھر اسے دہکایا جائے گا پھر وہ ایک پھونک مارے گا تو سارا میدان حشر دھوئیں سے اٹ جائے گا اس دن کے عذاب سے جو اپنے تئیں بچانا چاہے اسے وہ عبادت کرنی چاہیے جس سے بہتر عبادت اللہ کے نزدیک اور کوئی نہ ہو؟ لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ عبادت ہے۔ بے کسوں کی فریاد سننا، حاجت مندوں کی حاجت روائی کرنا اور بھوکے کو کھانا کھلانا۔

اور فرمایا جس میں یہ تین خصلتیں ہوں سمجھ لو کہ وہ بے شک اللہ کا دوست ہے ایک دریا کی سی سخاوت، دوسرے آفتاب کی سی شفقت، تیسرے زمین کی سی تواضع۔

سیرالاولیاء کی تالیف فیروز تغلق کے زمانے میں ہوئی ہے اور اس کے آخر میں جو ایک تاریخ درج ہے جس سے فیروز شاہ تغلق کی تاریخ وفات 759 ہجری برآمد ہوتی ہے اس سے یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ امیر خورد اس وقت تک زندہ تھے اور انھوں نے کتاب کی تالیف سے فارغ ہونے کے بعد بھی 25، 30 برس تک اس پر نظرثانی و اضافے کا کام جاری رکھا ہے۔ اس پر نگاہ کیجیے تو سیرالاولیاء میں جو کچھ ہے وہ بھی ہم عصر بیان نہیں ہے اور خواجہ بزرگ کے وصال سے تقریبا سوا سو برس کے بعد لکھا گیا ہے۔

میری تحقیق کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات و ملفوظات میں سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ماخذ سرور الصدور و نور البدور ہے جو آج تک نہیں چھپی ہے اور جس کے قلمی نسخے بھی اب ساری دنیا میں صرف دو تین ہی باقی رہ گئے ہیں۔

حضرت خواجہ بزرگ سے لاکھوں انسانوں کو فیض پہونچا اور آج بھی اسی طرح جاری ہے اور آپ کی حیات ظاہری کے زمانہ میں ہزارہا انسان بیعت ارادت کے شرف سے سعادت اندوز ہوئے مگر آپ کے خلفاء میں صرف تین نام ہی ملتے ہیں۔ خلیفہ اول حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ ہیں۔ جن کا انتقال اپنے پیر و مرشد کی حیات ہی میں ہوگیا تھا۔ دوسری خلافت خواجہ بزرگ اور قطب صاحب دونوں نے مل کر حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمہ کو دی تھی لیکن بابا صاحب کو خلاف اولی حضرت قطب صاحب سے پہونچی تھی اس لیے آپ ان کے ہی جانشین اور خلیفہ مانے جاتے ہیں تیسری خلافت سلطان التارکین ابو احمد شیخ حمید الدین بن محمد سوالی ناگوری علیہ الرحمہ کو ملی۔ یہ میدان ترک و تجرید کے ایسے یکہ تاز تھے کہ خود خواجہ بزرگ انھیں " سلطان التارکین " لقب مرحمت فرمایا تھا۔ آپ نے طویل عمر پائی اور 9/ ربیع الاخر 673 ہجری میں وصال ہوا۔ مزار مبارک ناگور میں مصدر فیوض و مرجع خلائق ہے۔

شیخ حمیدالدین ناگوری فرمایا کرتے تھے کہ:

" اول مولودے کہ بعد از فتح دہلی در خانہ مسلماناں آمد منم "۔

اور جیسا کہ ہم نے ابتداء میں ذکر کیا کہ دہلی کی فتح قطب الدین ایبک کے ہاتھوں 689 ہجری 1193ء میں ہوئی اور یہی شیخ ناگوری کی ولادت کا سنہ ہے۔ اس حساب سے انھوں نے تقریبا 84 سال کی عمر پائی۔ شیخ ناگوری عالم اور صاحب تصانیف بزرگ تھے۔ ان کی کتابیں حضرت نظام الدین اولیاء کے زیر مطالعہ رہتی تھیں اور انھوں نے کتابوں کے بعض اقتباسات اپنے قلم مبارک سے نقل کر رکھے تھے۔ جنھیں مؤلف سیرالاولیاء نے ماخذ کیا ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اخبار الاخیار میں شیخ ناگوری کی تصانیف کے بعض اقتباسات درج کیے ہیں اور یہ احتمال بھی ظاہر کیا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء سے ان کی ملاقات

ہوئی ہوگی۔ شیخ ناگوری کے پاس دو طناب زمین تھی جس میں اپنے ہاتھ سے تخم ریزی کرتے تھے اور اس کی پیداوار سے اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے تھے۔ ان کے فرزند شیخ عزیز الدین تھے جن کے تین بیٹے ہوئے۔ شیخ وحید الدین 724 ہجری 1324ء میں انتقال فرما گئے تھے۔ دوسرے شیخ نجیب الدین ابراہیم تھے۔ انھوں نے دہلی جا کر حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ میں کچھ وقت گذارا تھا۔ اور ان سے استفادہ کیا تھا۔ کہتے تھے:

"ایک دن میں شیخ نظام الدین کی خدمت میں گیا ہوا تھا ایک بوڑھے مولوی صاحب بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے آئے اور شیخ کی خدمت میں بیٹھ گئے تھے۔ کہنے لگے حضرت! آخر قاضی عالم کو یہ قبولیت کہاں سے نصیب ہوئی ہے ہم یہاں سرائے میں پڑے رہتے ہیں کوئی پوچھتا بھی نہیں اور وہ جیسے ہی آتے ہیں لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں اور اعزاز و اکرام بھی کرتے ہیں آج بھی ایسا ہی ہوا کہ فورا انھیں آگے آگے لے گئے خوب نذریں ملیں اور اعزاز و اکرام الگ رہا۔"

حضرت نظام الدین خاموشی سے مولوی صاحب کی گفتگو سنتے رہے اور کچھ نہیں فرمایا۔ پھر وہ مولوی صاحب خود ہی کہنے لگے۔ میں نے سنا ہے کہ ناگور میں کوئی پیر تھے۔ ان کا نام شیخ حمید الدین تھا۔ یہ قاضی عالم ان کے نظریافتہ ہیں۔ جب مولوی صاحب نے یہ جملہ کہا تو حضرت نظام الدین نے میری طرف اشارہ کیا کہ یہ صاحب انھیں کے پوتے ہیں۔ مولوی صاحب نے اٹھ کر میرے قدموں میں سر رکھ دیا۔

شیخ عزیز الدین کے سب سے چھوٹے بیٹے شیخ فریدالدین چاک پرّان بھی حضرت نظام الدین اولیاء کے ہم عصر تھے انھوں نے ایک صفر 729 ہجری (دسمبر 1328ء) کی ایک مجلس میں فرمایا کہ میں 77 سال سے وعظ کہہ رہا ہوں اور پہلی بار سات سال کی عمر میں منبر پر قدم رکھا تھا اس حساب سے 729 ہجری میں آپ کی عمر 84 سال کی ہوئی اور ولادت کا سنہ 645 ہجری 1247ء تسلیم کیا جائے گا۔ ان کے والد شیخ عزیز الدین کا انتقال 666 ہجری اور 677 ہجری کے درمیان کسی وقت ہوا۔

شیخ فرید الدین ناگوری دہلی آتے رہتے تھے اور آخر عمر میں یہیں آکر بس گئے تھے۔ ان کا انتقال 734 ہجری 1333ء میں حضرت نظام الدین اولیاء کے وصال سے نو سال کے بعد ہوا۔ آپ کی زندگی

کے آخری ایام میں 729 ہجری اور 734 ہجری کے مابین آپ کی مجالس اور ملفوظات قلم بند کیے گئے جس میں آپ نے اپنے دادا شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات بھی بیان فرمائے ہیں اور اسی کا نام "سرور الصدور و نور البدور" ہے اس کا ایک قلمی نسخہ جھنجھنوں کے حضرت شاہ نجم الدین صوفی کی خانقاہ میں تھا جس کی ایک نقل 1301 ہجری میں تیار کی گئی اور وہ نواب حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم کے ذخیرہ کتب میں موجود ہے جو اب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ کردیا گیا ہے۔ یہ 359 اوراق کا نسخہ ہے اور اس کا ایک تہائی حصہ "سرور الصدور" پر مشتمل ہے باقی دو تہائی کتاب میں شیخ حمید الدین صوفی، شیخ عزیز الدین اور شیخ فریدالدین ناگوری علیہم الرحمہ کے مکتوبات اور رسائل وغیرہ ہیں اور ان میں بھی بہت کارآمد مواد موجود ہے۔

ان مکتوبات و رسائل سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ فرید الدین صوفی پہلی بار صفر 681 ہجری (اپریل 1282ء) میں دہلی آئے تھے اور یہاں سے انھوں نے اپنے بھائی شیخ نجیب الدین ابراہیم کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ حضرت نظام الدین شیخ وقت ہیں، تم جب بھی مجھے خط لکھو، اپنی اور تمام اعزا کی جانب سے ان کی خدمت میں سلام ضرور لکھنا، اس میں ہرگز کوتاہی نہ ہو۔

"در مکتوبات کہ ایں طرف بفرستند برائے شیخ الوقت شیخ نظام الملت والدین سلام بنویسند واز زبان یاران جملہ بجانب او سلام بنویسند تقصیر نہ نکنند، مرد صاحب درد، در جملہ دہلی جز او نیافتم او صلی اللہ برکاۃ انفاسہ الی کافۃ المسلمین۔

حضرت نظام الدین اولیاء ان سے ملاقات کرنے کیلئے دوبارہ بنفس نفیس تشریف لے گئے اور ان کا وعظ سننے کا اشتیاق بھی ظاہر کیا، جس حجرے میں یہ ٹھہرے ہوئے تھے اسے دیکھ کر بہت حیرت کا اظہار فرمایا کہ آپ اس تنگ و تاریک حجرے میں رہ کیسے رہے ہیں؟ پھر غیاث پور جاکر اپنے ایک خادم محمد صوفی کو بھیجا کہ وہ شیخ فرید الدین کا سامان لے آئے اور ان سے کہے کہ میرے حجرے کے اوپر اتنی جگہ ہے کہ آپ وہاں آرام سے ٹھہر سکتے ہیں، شہر میں جہاں کہیں حضرت نظام الدین کو بلایا جاتا تھا آپ کہلا بھیجتے تھے کہ شیخ فرید ناگوری بھی میرے ساتھ آئیں گے، ایک خط میں لکھتے ہیں۔

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالی بسیار تقاضائے تذکیر می کند و این ضعیف چو الطاف و کرم او از جملہ گذشتہ است دفع نمی تواند گفت ان شاء اللہ تعالی باحسن الاحوال میسر گردد شیخ نظام الدین فرمودہ بود و دو بار بریں ضعیف آمدہ بود ۔ بغایت تعجب کرد کہ دریں حجرہ چہ گونہ می باشید ؟ بعدازاں بدست حاجی محمد پیغام کرد کرد کہ ایں جاموضع است بربالائے حجرہ من اگر بیایند کرم کردہ باشند و دعاگوئے چوں ایں جا مسجد جمعہ نزدیک بود ۔ بخدمت مولانا شرف الدین موضحی سلمہ اللہ رفتہ می باشد ۔ عذر گفت ۔ دریں مدت بخانہ مراجعت خواہد افتادو زحمت دادہ نمی آید مع ہذا ہر کجا بدعوتے اورا بطلبند ایں ضعیف را بطلبد و انچہ از کرم طبع ایشاں سزد از اکرام دریغ نداشت حق سبحانہ وتعالی توفیق حق گذاری الطاف ایشاں کرامت کناد "

شیخ وقت شیخ نظام الدین سلمہ اللہ تعالی وعظ کا بہت تقاضا کرتے ہیں اور چونکہ ان کا الطاف وکرم سب سے زیادہ ہے اس لیے یہ ضعیف انکار بھی نہیں کرسکتا ۔ ان شاء اللہ تعالی بہت اچھی طرح میسر ہوگا ۔ شیخ نظام الدین نے فرمایا تھا اور دوبار اس ضعیف کے پاس تشریف بھی لائے تھے ۔ بہت تعجب کیا کہ تم اس کوٹھری میں کس طرح رہ رہے ہو ؟ پھر حاجی محمد کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ یہاں حجرے کے اوپر ایک جگہ موجود ہے ۔اگر آپ یہاں آجائیں تو کرم ہوگا ۔ مگر اس دعاگو نے اس لیے معذرت کرلی کہ یہاں سے جامع مسجد قریب ہے اور مولانا شرف الدین موضحی سلمہ اللہ کی خدمت میں بھی جانا ہوتا رہتا ہے ۔ اس مدت میں گھر کو واپسی ہوجائے گی اور زحمت دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی ۔ علاوہ ازیں جہاں کہیں انھیں دعوت میں بلایا جاتا ہے اس ضعیف کو بھی بلالیتے ہیں اور جو ان کی طبیعت کے شایان شان ہے عزت و اکرام میں دریغ نہیں کرتے ۔اللہ تعالی ہمیں ان کے الطاف وکرم کا حق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے ۔

دوسری بار شیخ فرید صوفی دہلی کب آئے اس کا علم نہیں ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے اس بار دہلی سے واپسی محرم 687 ہجری (فروری 1288 ء) میں ہوئی تھی ۔ آخری سفر میں زن و فرزند کے ساتھ دوشنبہ 21/ رمضان 730 ہجری کو دہلی پہونچے تھے ۔ اس وقت دہلی بالکل اجڑ چکی تھی ۔ سلطان محمد بن تغلق نے ساری آبادی کو یہاں سے دولت آباد منتقل کردیا تھا مگر 729 ہجری میں ملتان میں کچھ شورش

ہوئی۔ اسے دفع کرنے کی نیت سے محمد تغلق دلی آیا ہوا تھا۔ اس نے شیخ فرید الدین صوفی کو بھی دولت آباد جانے کا حکم دیا اور یہ 731 ہجری کے آخر میں وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت حضرت برہان الدین غریب اور امیر حسن علاء سجزی دہلوی دونوں دولت آباد میں موجود تھے۔ اس لیے یقین ہیکہ ان بزرگوں سے بھی ملاقات رہی ہوگی۔ ملتان میں غیاث الدین تغلق کے متبنی ملک ابراہیم کی بغاوت کو دبانے کیلئے محمد بن تغلق کو جو پاپڑ بیلنے پڑے اس سے یہ سبق ضرور مل گیا کہ دولت آباد میں بیٹھ کر شمالی ہندوستان پر حکومت کرنا آسان نہیں ہوگا۔ اس لیے پھر دہلی واپس جانے کا حکم جاری کردیا اور ایسا معلوم ہوتا ہیکہ شیخ فرید الدین ناگوری بھی شعبان 732 ہجری (اپریل 1232ء) میں پھر دہلی واپس تشریف لے آئے۔ دہلی میں بجے منڈل سے مشرق کی جانب ان کا مکان تھا اور اب اسی جگہ مزار مبارک ہے۔ انتقال ہفتے کے دن یکم جمادی الاولی 734 ہجری (8/ جنوری 1234ء) کو ہوا تھا۔

سرور الصدور میں حضرت شیخ حمید الدین ناگوری علیہ الرحمہ کے بارے میں ان کے فرزند شیخ عزیز الدین کی روایات بھی ہیں اور خود شیخ فرید الدین نے بھی اپنے مشاہدات و معلومات درج کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ حمید الدین سوالی نے حج بھی کیا تھا اور وہ حضرت خواجہ بزرگ خواجہ معین الدین غریب نواز قدس سرہ کی خانقاہ میں امامت سے مشرف تھے۔ خواجہ بزرگ ان کی اقتداء میں نماز ادا فرماتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی شخص کچھ پوچھنے یا وضاحت طلب کرنے کیلئے آجاتا تھا اور خواجہ بزرگ اسے شیخ حمید الدین ناگوری کی طرف بھیج دیتے تھے۔ ایک بار خواجہ بزرگ اجمیر کے قلعے میں تشریف فرما تھے۔ ایک درویش آئے اور انھوں نے پوچھا کہ وہ کون سی باتیں ہیں جو ایک تارک دنیا میں پائی جانی چاہئیں۔ حضرت خواجہ خواجگان نے فرمایا کہ "شریعت میں تو صرف یہ ہے کہ جو کچھ خدا نے کرنے کا حکم دیا ہے اسے کرے اور جن باتوں سے باز رہنے کو کہا ہے ان کے پاس نہ پھٹکے۔ ایسے شخص کو اگر کوئی تارک دنیا کہے تو بے جا نہ ہوگا مگر طریقت میں نو باتیں اور ہیں جب تک وہ پوری نہ ہوں کسی کو تارک دنیا نہیں کہا جاسکتا"۔ پھر آپ نے حضرت شیخ حمید الدین صوفی ناگوری کی طرف دیکھا اور فرمایا: "تم ان درویش کو "ترک" کے بارے میں تفصیل بتادو۔ اور لکھ کر بھی دے دو تاکہ یہ کسی عالم خدا" کو دکھالیں اور پھر بہت سے مسلمانوں کو نفع پہونچائیں۔

اب ان درویش کو شیخ ناگوریؒ نے بتایا کہ صوفیائے چشت کے نزدیک "ترک" کیا ہے۔ اول یہ کہ کسب نہ کرے۔ دوسرے قرض نہ مانگے۔ تیسرے یہ کہ اگر سات روز کا فاقہ ہو، تب بھی کسی کے سامنے اپنا راز فاش نہ کرے اور اس سے مدد طلب نہ کرے۔ چوتھے یہ کہ اگر بہت سا کھانا روپیہ یا غلہ یا کپڑا اسے مل جائے تو اگلے روز کیلئے کچھ بچا کر نہ رکھے۔ پانچویں یہ کہ کسی کے حق میں دعائے بد نہ کرے۔ اگر کوئی بہت ستائے تو بس اتنا کہے کہ یا اللہ اپنے اس بندے کو راہ راست دکھا دے۔ چھٹے یہ کہ اگر کوئی اچھا کام بن پڑے تو اسے اپنے پیر کی شفقت، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور حق تعالی کی رحمت جانے۔ ساتویں یہ کہ اگر کوئی برا فعل سرزد ہو تو اسے اپنے نفس کی شومی سمجھے۔ خود کو برے اعمال سے بچائے رکھے اور اللہ سے ڈرتا رہے تاکہ آئندہ وہ خطا پھر سرزد نہ ہو۔ جب اس منزل تک پہنچ جائے تو آٹھواں مرحلہ یہ ہے کہ دن میں روزہ رکھے اور رات کو قیام کرے۔ نویں یہ کہ خاموش رہے اور صرف اسی وقت کلام کرے جب حاجت اصلی ہو۔ چنانچہ شریعت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام میں یہی ہے کہ بولنا حرام ہے۔ اور خاموش رہنا بھی حرام ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہی بات بولے جس کا مقصد خوشنودی حق تعالی کا حصول ہو"۔

اس مختصر تقریر میں جو نو نکات پر مشتمل ہے۔ شیخ ناگوری نے اپنے پیر و مرشد کی ایما سے سلوک طریقت کا خلاصہ پیش کردیا ہے۔ باقی جو کچھ ہے وہ سب اس کی تفسیر ہے۔ یہاں یہ سوال ہوسکتا ہے کہ ترک پر اتنا زور کیوں دیا گیا ہے؟ اس سلسلے میں یہ ملحوظ رہے کہ خواجہ صاحب نے فرمایا کہ شریعت میں "ترک دنیا" صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اوامر و نواہی کا خیال رکھیں اور خدا نے اور اس کے رسول نے جن باتوں کو چھوڑنے کیلئے کہا ہے ان کے پاس نہ پھٹکیں۔

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی بھی اپنے مریدوں سے یہی فرمایا کرتے تھے کہ "وصیت ہمیں است کہ انچہ خدا و رسول خدا منع کردہ است آں نکنی"۔

شیخ ناگوریؒ نے فرمایا کہ کل خدا یہ نہیں پوچھے گا کہ تم ہمارے لیے کیا لے کر آئے؟ یہ پوچھے گا بتاؤ ہماری خاطر تم نے کیا چیز ترک کی تھی؟

یہ "الدین یسر" کے مصداق وہ فلسفہ ہے جس کا عام مسلمان کو مکلف کیا گیا ہے۔ اس کے بعد نو مرحلے اپنے شیخ کی نیابت میں حضرت ناگوری نے بیان فرمائے۔ وہ دراصل ایک درویش سے خطاب ہے یعنی ان شرائط کی تکمیل کی توقع ان خواص سے کی جائے گی جو روح شریعت تک پہونچنے کے آرزو مند ہیں۔

طبقۂ علماء ہی میں نہیں اس وقت صوفیہ میں بھی ایسے بزرگ تھے جنھوں نے دنیا جمع کر رکھی تھی اور اس کی بدولت ان پر وہ آفتیں آرہی تھیں جو دولت کے ساتھ آنی چاہئیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سارے عالم اسلام میں یہ بحث چھڑی ہوئی تھی کہ غنا افضل ہے یا فقر۔ شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں "جدال سعدی بامدعی" کے عنوان سے پورا معرکہ فقر و غنا کے موضوع پر ایک رسالہ تصنیف کیا تھا اور اس بارے میں وہ دوسرے درویشوں سے مراسلت بھی رکھتے تھے چنانچہ ناگور میں ایک تاجر تھا وہ ہر سال تل لے کر ملتان کی منڈی میں بیچنے جاتا تھا اور وہاں سے روئی لے کر ناگور آتا تھا۔ وہ شیخ حمید سوالی کے خطوط حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے نام لے جاتا تھا اور ان کا جواب لاکر حضرت کو دیا کرتا تھا۔ ان خطوط میں شیخ ناگوری نے حضرت ملتانی کی دولت مندی پر اعتراضات کیے تھے۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ خدا نے متاع دنیا کو متاع قلیل فرمایا ہے "قل متاع الدنیا قلیل" اور میرے پاس اس کا اقل قلیل ہے۔ اس پر شیخ ناگوری نے پھر کچھ لکھا تو حضرت ملتانی نے جواب نہیں دیا۔

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نجم الدین صغری نے شیخ جلال تبریزی پر اتہام لگایا اور التمش کے دربار میں ان کے خلاف محضر مقرر ہوا اور انھوں نے شیخ بہاء الدین ملتانی کو اپنا گواہ بنا کر پیش کیا تو اس محفل میں صوفی حمید الدین ناگوری بھی موجود تھے۔ انھوں نے شیخ ملتانی سے کہا کہ جہاں کہیں مال ہوتا ہے وہاں مار (سانپ) بھی رہتا ہے۔ اس میں کیا حکمت ہے؟ چنانچہ کہاوت بھی ہے کہ "گنج با مار و گل باخار" مال اور مار میں کچھ صوری مناسبت بھی ہے مگر معنوی مناسبت کیا ہے، یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ شیخ ملتانی نے فرمایا کہ اگرچہ دونوں میں کوئی صوری مناسبت نہیں ہے البتہ معنوی مناسبت موجود ہے اور وہ یہ کہ اپنے زہر کی وجہ سے مار (سانپ) مہلک ہے اور مال بھی اکثر لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ شیخ ناگوری نے فرمایا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مال اور مار ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں تو جو مال جمع کرتا ہے۔ وہ گو مار.. جمع کر رہا ہے۔ شیخ ملتانی سمجھ گئے کہ یہ میری دولت کی طرف

اشارہ ہے فرمانے لگے کہ اگر کسی کو سانپ کا منتر یاد ہو تو اسے سانپ کا زہر کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ شیخ ناگوری نے کہا کہ ایک پلید، زہر دار اور پرخار جانور کو پالنا اور پھر اس کا منتر یاد رکھنے کے جھنجھٹ میں پھنسنا کون سی دانائی ہے؟ جب شیخ ملتانی نے دیکھا کہ ان کی دلیل قوی ہوتی جارہی ہے تو کہنے لگے کہ یہ الزام تو مجھ پر ہی نہیں، میرے پیر و مرشد پر بھی عائد ہوتا ہے اسی وقت شیخ شہاب الدین سہروردی کی روح پر فتوح حاضر ہوئی اور کہا کہ بہاء الدین ان سے یہ کہدو کہ تمھاری درویشی میں ایسا حسن و جمال نہیں ہے جسے نظر لگنے کا اندیشہ ہو اور ہماری درویشی میں اتنا جمال کمال ہے کہ اسے نظر گذر سے بچانے کیلئے ٹیکا بھی درکار ہے۔ اس لیے ہم نے "وسمہ سیاہی دنیا" اس کے چہرے پر لگادیا ہے۔ جب شیخ ملتانی نے حضرت ناگوری سے یہی بات کہی تو انھوں نے فرمایا:

"سبحان اللہ آپ کی درویشی میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ و سلم کی درویشی سے زیادہ تو حسن و جمال نہیں ہے۔" آنحضرت نے غنا پر فقر کو ترجیح دی ہے اور فرمایا "الفقر فخری و الفقر منی:" اس پر شیخ ملتانی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ملتانی کے ایک صاحبزادے ناگور تشریف لائے تو انھوں نے دیکھا کہ شیخ حمید الدین ناگوری جمعہ کی نماز میں موجود نہیں۔ اس پر انھوں نے خاصا ہنگامہ کیا تو شیخ ناگوری نے فرمایا کہ ناگور مصر کے حکم میں نہیں ہے اس لیے یہاں جمعہ کا وجوب بھی نہیں ہے۔ مگر انھوں نے علماء کو ساتھ ملا کر خاصی بحث کی۔ شیخ نے فرمایا کہ تم نے جتنا ہمارے اوقات میں خلل ڈالا ہے۔ اتنی دیر کیلئے "ماترا حبس درویشاں دادیم"

شیخ حمید کے انتقال کے بعد حضرت ملتانی کے یہ فرزند کہیں جارہے تھے۔ راستے میں ایک ڈاکو نے انھیں گرفتار کرلیا اور کہا کہ تمھیں اپنے والد ماجد کی چھوڑی ہوئی جائیداد سے اتنا مال ملا ہے وہ سب لاؤ جب رہا کروں گا۔ انھوں نے اپنے بھائی شیخ صدر الدین ملتانی کو قید کا ماجرا اور رہائی کی شرط لکھی وہاں سے مال آیا تب انھیں نجات ملی۔

حضرت ملتانیؒ کے پوتے حضرت شیخ رکن الدین ملتانی علیہ الرحمہ 720 ہجری میں سلطان قطب الدین مبارک خلجی کی دعوت پر دہلی آئے تھے جس نے انھیں حضرت نظام الدین اولیاء

کا اثر و رسوخ ختم کرنے کی نیت سے بلوایا تھا مگر اسی سال خسرو خاں نے سلطان کو قتل کر دیا، اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ حضرت شیخ رکن الدین پھر بھی چار سال تک دہلی میں رہے۔ انھوں نے حضرت نظام الدین اولیاء کے جنازے کی نماز پڑھائی تھی اور اس وقت یہ فرمایا تھا کہ:

"امروز مرا تحقیق شد کہ چہار سال کہ مرا در دہلی داشتند مقصود ایں بود کہ بہ شرف امامت نماز جنازہ سلطان المشائخ مشرف شوم۔" (سیر الاولیاء)۔

لیکن دہلی میں ان کے طویل قیام کا سبب معلوم ہوا کہ حضرت شیخ رکن الدین ملتانی خسرو خاں کے محل کے زینے سے گر پڑے تھے جس سے چہرہ مبارک پر بہت چوٹ لگی تھی اور پاؤں کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی تھی۔ یہ 720 ہجری 1321ء کا واقعہ ہوگا کیونکہ اسی سال چار ماہ اور چند روز کیلئے برسر اقتدار رہ کر غیاث الدین تغلق کے ہاتھوں خسرو خاں مارا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مجبوری کی وجہ سے آپ کو ایک طویل عرصہ تک دہلی میں قیام کرنا پڑا ہوگا۔

شیخ فرید الدین نے فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ سے سنا ہے حضرت خواجہ معین الدین رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔

باں اے دل گرم، بادم سرد بساز	بادیدہ لعل و بارخ زرد بساز
فریاد رسے چو نیست فریاد مکن	درماں چو نمی بینی بادرد بساز

اور فرمایا کہ شیخ جیو نے یہ اشعار بھی اکثر "خواجہ جیو" کو پڑھتے سنا ہے

اے دل غم آں مخور کہ فرداچہ شود	زیرا کہ ہمہ خوشی دراں پے بشود
حکمے کہ بکر داشت خداوند جہاں	دانم چہ شود، واگر ندانم چہ شود؟

5/ جمادی الثانی 727 ہجری کی مجلس میں شیخ فرید ناگوری نے فرمایا:۔

شیخ بزرگ قدس اللہ روحہ العزیز امامت خواجہ جیو ہم کردے۔ چوں خواجہ جیو اجمیر فرود آمد ملکے کہ دراں وقت بود خواجہ جیو را مرید شد و دختر کہ بخدمت خواجہ جیو فرستاد و خوجہ جیو درآں وقت معمر شدہ

بود میگویند عمر ایشاں بنود سال رسیدہ بود۔ خواجہ جیو راازاں دختر یک۔ دو فرزنداں شدند تاوقتیکہ شیخ بزرگ راگفت: حمید چیست اینکہ ہر گاہ کہ مارا دراں جوانی کہ مجرد۔ بودہ ایم حاجتے بشدے دعامیکردیم و درحال اجابت شدے داین ساعت کہ پیر شدیم و فرزندان آمدند ہرگاہ کہ حاجتے می شود بسیار می باید و دعا ہم کردہ شود و لیکن بعداز دیر تر باجابت می رسد و حاجت برمی آیداین حکمت چیست؟ شیخ بزرگ فرمود گفتم یا شیخ شمارا بہتر روشن است از قصہ مریم۔ دراں وقت کہ مجرد بود بے خواست او میوہ زمستانی بتابستان می رسید و میوہ تابستان بزمستان می آمد کہ ولش بخدا یکتا بود۔ چوں عیسیٰ علیہ السلام بزاد۔ مریم علیہا السلام منتظر بود کہ ہم چنا خواہد رسید فرمان آمد وھزی الیک بجزع النخلۃ چوں دلت باو یکتا بود۔ نخواستیم کہ برائے نان دودلہ مانی"۔

از شیخ خواجہ جیو چون ایں بشنیدند پسندیدند"۔

سرور الصدور سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان شمس الدین التمش کے زمانے میں 633۔ 607 ہجری چالیس یاروں کا قافلہ ایک ساتھ دہلی میں آیا تھا۔ ان میں ہر ایک کو سلطان نے جائزہ گراں دیا تھا۔ ان میں شیخ نجیب الدین بخشی بھی تھے۔ انھوں نے اپنا حصہ کچھ حاجت مندوں میں تقسیم کردیا اور کچھ دوستوں کی ضیافت میں۔ التمش نے انھیں اپنا منہ بولا باپ بنالیا تھا اور دہلی کی شیخ الاسلامی ان کو تفویض کی۔ اس لیے یہ دہلی میں رہنے لگے۔ دوسرے احباب مختلف شہروں میں جاکر بس گئے۔ حضرت شیخ معین الدین اجمیر میں تشریف لے آئے جب شیخ نجیب الدین دہلی کے شیخ الاسلام تھے۔ خواجہ بزرگ ان سے ملاقات کیلئے دہلی تشریف لائے تھے اور شیخ حمید الدین ناگوری بھی دہلی آیا کرتے تھے۔ ایک بار کہیں دعوت میں یہ سب بزرگ موجود تھے۔ شیخ نجیب الدین بخشی۔ شیخ معین الدین۔ شیخ جلال الدین تبریزی اور شیخ قطب الدین بختیاری۔ اور شیخ حمید الدین صوفی ناگوری۔ اس وقت موضوع گفتگو یہ تھا کہ اس زمانے میں "شیخ وقت" کون ہوسکتا ہے؟ اور کون ہے؟ سب اپنی اپنی رائے ظاہر کررہے تھے۔ شیخ حمیدالدین ناگوری نے کہا کہ اس زمانے میں شیخ وقت "جیتل" (پیسہ) ہے۔ سب حضرات کہنے لگے کہ شیخ! ہم سنجیدگی سے بات کررہے ہیں۔ اور تم مذاق میں جواب دے رہے ہو۔ شیخ ناگوری نے کہا کہ میں بھی سنجیدگی سے ہی کہہ رہا ہوں۔ اس زمانے میں جس کے پاس جیتل زیادہ ہوں۔ وہی "شیخ وقت" مانا جاتا ہے۔ ان کا یہ پرمعنی فقرہ سن کر سب خاموش ہوگئے۔

شیخ حمید الدین صوفی نے ایک بار 5/ جمادی الاولی 666 ہجری کو فرمایا کہ میرے تین پیر ہیں۔ ایک پیر ارادت حضرت شیخ معین الدین اجمیری۔ دوسرے پیر صحبت مولانا شمس الدین حلوائی۔ تیسرے پیر خرقہ شیخ حمید الدین محمد جوتنی۔

لیکن انھیں حضرت خواجہ بزرگ غریب نواز سے بھی خرقہ ارادت ملا تھا اور وہ تبرکات ان کے پوتے شیخ فرید الدین صوفی کے پاس محفوظ تھے۔ جمال الدین کلدنی متصرف ناگور کو انھوں نے ایک کلاہ بھیجی اور اس کے ساتھ خط لکھا تھا:

"کلاہے کہ ایں ضعیف رااز شیخ رسیدہ است و شیخ رااز خدمت اجل شیخ معین الدین سجزی قدس اللہ روحہما رسیدہ است فرستادہ شدباید کہ بحرمت و تعظیم تمام بر سر نہند و دوگانہ گذارند و مرادے کہ پیش دل آید بخواہد یقین است کہ بیابد بفضل اللہ۔

حضرت خواجہ بزرگ کا خرقہ بھی شیخ فریدالدین صوفی تک پہنچا تھا۔ انھیں بیعت کرتے وقت یہ اقرار لیا تھا کہ

"درویشی را دوست دارم و درویشاں را خدمت کنم"۔

پھر اپنا جبہ اتار کر پہنایا اور کہا

"ایں خرقہ شیخ است کہ بمن رسیدہ بود ترامی پوشانم و ایں ضعیف راپوشانیدند"

غرض یہ کتاب حضرت خواجہ بزرگ اور ان کے ایک جلیل القدر خلیفہ کے حالات و ملفوظات کا سب سے اہم اور قابل قدر ماخذ ہے۔ اس میں ایک کتاب شرف الانوار کا حوالہ بھی آیا ہے اور ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی شیخ حمید الدین ناگوری کے ملفوظات پر مشتمل تھی اور فصل اور نوع کے عنوان سے مختلف فصول و ابواب میں تقسیم کرکے لکھی گئی۔ اب یہ ناپید ہوچکی ہے۔ اگر کہیں اس کا نسخہ دستیاب ہوجائے تو اس میں بھی حضرت خواجہ اجمیری کے بارے میں بہت قیمتی معلومات ملیں گی اور یہ حضرت کے حالات میں "سرور الصدور" سے بھی قدیم ماخذ ہوگی۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہ

یوں تو سبھی سلسلوں کے صوفیوں نے عوام میں مقبولیت حاصل کی ہے لیکن چشتی صوفیوں نے خاص طور پر عام انسانوں کے دلوں کو جیتا ہے اور وہ آج تک عوام کی محبت و عقیدت کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ چشتیوں کے سرتاج حضرت خواجہ معین الدین سجزی اجمیری علیہ الرحمۃ آج بھی "غریب نواز" کہلاتے ہیں اور ماہ رجب کی ابتدائی تاریخوں میں ہندوستان بھر سے لاکھوں زائرین ان کے آستانے پر والہانہ عقیدت کے ساتھ حاضری دیتے ہیں۔ حضرت خواجہ غریب نواز نے جب اجمیر کو اپنا مسکن بنایا تھا اس وقت وہاں مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی۔ اسی سے ظاہر ہیکہ عوام کا دل جیتے بغیر وہ وہاں اپنی خانقاہ قائم نہیں کرسکتے تھے۔ حضرت خواجہ غریب نواز کے خلفاء میں سب سے ممتاز شخصیت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ کی ہے۔ انھوں نے دلی کو اپنا مرکز بنایا تھا۔ ہر چند وہ عزلت اور استغراق کے عالم میں رہتے تھے اور ان کی عمر بھی زیادہ نہیں ہوئی صرف 53 سال دو ماہ 14 (مخزن افغانی) تک حیات سے بہیت رہے اور دلی میں ان کا قیام 30 سال کے لگ بھگ رہا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں انھوں نے شہنشاہ وقت سے لے کر ادنی اور غریب انسانوں تک سبھی کو اپنا ایسا گرویدہ بنادیا تھا کہ جب حضرت خواجہ اجمیری آخری بار دلی تشریف لائے (633ھ) تو اس وقت دلی کے شیخ الاسلام نجم الدین صغری نے ان سے شکایت کی کہ آپ نے شہر میں اپنا ایسا مرید بٹھا رکھا ہے جس کے سامنے میری شیخ الاسلامی کا چراغ نہیں جلتا اور مجھے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس پر حضرت غریب نواز نے فرمایا، تم اطمینان رکھو میں قطب الدین کو اپنے ساتھ اجمیر لے جاؤں گا۔ جب دلی والوں کو یہ معلوم ہوا کہ قطب صاحب اپنے پیر و مرشد کے ساتھ اجمیر کی طرف کوچ کررہے ہیں تو سارے شہر میں کہرام مچ گیا۔ یہ دونوں بزرگ آگے آگے جارہے تھے اور ان کے پیچھے شہنشاہ وقت سلطان شمس الدین التمش اپنی آنکھوں میں آنسو لیے منت سماجت کررہا تھا اور اس کے ساتھ ساری خلق خدا گریہ کناں تھی۔ جب ایسا کہرام دیکھا تو حضرت غریب نواز نے خواجہ قطب الدین سے فرمایا کہ کسی ایک شخص کا دل رکھنے کیلئے خدا کی اتنی مخلوق کا دل توڑنا جائز نہیں ہوسکتا۔ تم دلی ہی میں رہو۔ اسی ایک واقعے سے ان کی ہر دلعزیز شخصیت کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمۃ وسط ایشیاء کے قصبہ مرغینان کے گانو اوش کے رہنے والے تھے (جوامع الکلم 71) بعض تذکرہ نگاروں نے اوش کو بغداد کے پاس بتایا ہے مگر یہ غلط ہے۔ آپ کے والد محترم کا نام احمد بن موسی بتایاجاتا ہے (تاریخ خان جہانی مصنفہ نعمت اللہ ہردی) بعض تذکروں میں کمال الدین احمد لکھا ہے اقتباس الانوار میں آپ کو حسینی سید بتایاگیا ہے اور ایک شجرہ بھی دیا گیا ہے مگر تاریخ جان جہانی کے مؤلف خواجہ نعمت اللہ ہردی نے آپ کو روہیلہ افغانوں کے قبیلہ سڑبنی کا چشم و چراغ بتایا ہے۔ یہ کتاب 1021ھ کی تالیف ہے۔ حضرت قطب صاحب کی ولادت 580ھ کے قریب ہوئی اور ابھی آپ دو برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کی تعلیم و تربیت والدہ ماجدہ کی نگرانی میں ہوئی جب آپ مکتب جانے کے قابل ہوئے تو والدہ محترمہ نے ایک ہمسایہ کے ساتھ آپ کو محلے کی مسجد میں پڑھنے کیلئے بھیجا۔ مگر راستے میں ایک مرد غیب مل گئے اور انھوں نے آپ کو ایک بزرگ ابو حفص کی خدمت میں پہنچا دیا۔ انھوں نے خاص توجہ سے ظاہری و باطنی تربیت فرمائی۔ جب آپ کی عمر 25 سال تھی حضرت خواجہ معین الدین سجزی کا اوش سے گزر ہوا (گلزار ابرار 39) آپ اسی وقت ان سے بیعت ہوگئے۔ مرشد نے انھیں تمام فضائل سے آراستہ دیکھا تو اپنی خلافت بھی مرحمت فرما دی۔ سیر الاولیاء کا بیان ہیکہ رجب 522ھ میں بغداد کی مسجد ابواللیث ثمرقندی میں بیعت کی تھی مگر یہ سنہ درست نہیں۔ اب آپ کو شدید طلب پیدا ہوئی کہ عالم اسلام لی بڑی خانقاہوں میں جاکر مزید فیوض حاصل کریں۔ چنانچہ کہا جاتا ہیکہ آپ بغداد تشریف لے گئے اس وقت وہاں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی اور شیخ اوحد الدین کرمانی جیسے باکمال موجود تھے۔ ان کی صحبت سے استفادہ کیا۔ وہاں سے ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور حضرت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کی خانقاہ میں کچھ عرصے تک ملتان میں رہے۔ اس وقت ناصر الدین قباچہ ملتان کا حاکم تھا اور اس سرحدی علاقے کو منگولوں کے لشکر نے اپنے نرغے میں لے رکھا تھا۔ کہا جاتا ہیکہ قباچہ نے آپ سے دعا کی درخواست کی تو آپ نے ایک تیر پر کوئی دعا دم کرکے اسے دی اور فرمایا کہ اسے کسی بلند مقام سے دشمن کے لشکر کی طرف پھینکو۔ قباچہ نے ایسا ہی کیا اور اسی رات منگول کسی دوسری طرف نکل گئے۔ اس زمانے میں حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر نوعمر تھے اور درسی کتابیں پڑھ رہے تھے ان سے قطب صاحب کی پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ دلی آکر قطب صاحب نے ابتداء میں کیلوکھیڑی میں قیام فرمایا تھا بعد کو ملک اعزاز

الدین کی مسجد کے سامنے ایک مکان میں منتقل ہوے۔ یہاں آپ ایک دن عید گاہ سے نماز پڑھ کر واپس آرہے تھے راستے میں ایک مقام پر اچانک ٹھہر گئے اور فرمایا کہ "اس زمین سے دلہائے سوختہ کی بو آرہی ہے" (سیر اولالیاء 65) تحقیق کرکے اس قطعہ زمین کے مالک کو بلایا گیا اور وہ زمین آپ نے خرید لی اسی پر آج کل آپ کی ابدی آرام گاہ بنی ہوئی ہے اور یہی وہ مقدس مقام ہے جہاں گزشتہ سات سو برسوں سے ہزاروں انسانوں کے سر عقیدت سے جھک رہے ہیں۔ حضرت قطب صاحب کا مزار طول و عرض میں غیر معمولی طور پر بڑا ہے۔ اس کا سبب یہ ہےکہ اس زمانے میں ساری دہلی نے آپ کے مزار مبارک پر مٹی ڈالی ہوگی اور دو مٹھی مٹی سے اتنی بڑی قبر بن گئی اس سے مجمع کی کثرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

حضرت قطب صاحب اکثرو بیشتر مشغولی اور استغراق کے عالم میں رہتے تھے۔ آپ کی خوراک بھی بہت کم تھی۔ اکثر روزہ رکھتے تھے اور نیند بھی بس برائے نام ہوتی تھی۔ آپ کی باطنی مشغولی کا یہ عالم تھا کہ آپ کو کسی آنے والے کی خبر کرنی ہوتی تھی تو خادم آپ کے دونوں شانے پکڑ کر ہلاتا تھا (تاریخ حبیبی 75) اس وقت آپ اشارہ کرکے دریافت فرماتے کہ کیا بات ہے؟ خادم عرض کرتا کہ بہت سے لوگ سلام کرنے کو حاضر ہیں۔ آپ اشارہ فرماتے کہ ان لوگوں کو باریاب کیا جائے اور ان کے آنے پر ایک ایک کوزہ سادہ پانی پیش کیا جاتا تھا۔ لوگ پانی پیتے اور آپ ہاتھ اٹھا کر سورہ فاتحہ پڑھتے اور دعا کرکے آنے والوں کو رخصت فرمادیتے۔ آپ کی زندگی بہت عسرت اور تنگ دستی میں بسر ہوتی تھی۔ اس لیے زائرین کو صرف پانی سے ہی نوازا جاتا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ ہماری خانقاہ میں لنگر 50 سال کے بعد جاری ہوگا (تاریخ حبیبی 76) چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الہی کی خانقاہ پورے 50 برس کے بعد بنی اور اس میں ایسا لنگر جاری ہوا کہ سارے ملک میں اس کی نظیر نہیں ملتی تھی اور وہ لنگر آج تک جاری ہے۔ اگر کبھی آپ گھر سے باہر تشریف لے جاتے تو راستے میں بھی استغراق کا عالم طاری رہتا تھا۔ چلتے ہوئے آپ کا سر کسی دیوار سے لگ جاتا تھا تو آنکھیں کھول کر راستہ درست کرتے تھے۔ حضرت قطب صاحب کا وصال بھی وجد کیف اور استغراق تمام کی حالت میں ہوا اس کا واقعہ یوں ہےکہ 12/ ربیع الاول 634ھ یعنی 13/ نومبر 1236ء کو جمعرات کے دن حضرت غریب نواز کے بھانجے شیخ علی سجزی کی خانقاہ میں عرس تھا اس میں سماع کی محفل منعقد ہوئی تھی جس میں قطب صاحب بھی تشریف لے گئے تھے۔ وہاں قوال نے حضرت شیخ احمد جام کی یہ غزل شروع کی۔

کشتگان خنجر تسلیم را
ہر زماں از غیب جانے دیگر است

آپ کو اس شعر پر وجد ہوا اور قوال سے بار بار اسی کو پڑھواتے رہے۔ یہ کیفیت تین دن رات تک طاری رہی۔ جب نماز کا وقت آتا تو آپ عالم صحو میں جاتے اور پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے۔ اس سے فارغ ہوتے ہی پھر وہی حال طاری ہوجاتا تھا۔ یہاں تک کہ آپ نے 14/ ربیع الاول 634ھ یعنی 15/ نومبر 1236ء کو اسی عالم میں انتقال فرمایا۔ انتقال کے وقت آپ کا سر مبارک قاضی حمیدالدین سہروردی کی گود میں تھا۔ آپ کی تاریخ وفات کسی نے اسی زمانے میں آہ خواجہ جی" (634ھ) سے برآمد کی تھی۔ قطب صاحب نے غالباً دو نکاح کیے۔ پہلا نکاح اوائل شباب میں ہوا تھا اس وقت آپ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے قبل تین ہزار بار دورو شریف پڑھ کو ثواب بارگاہ رسالت میں پیش کیا کرتے تھے۔ آپ کے ایک مرید احمد رئیس نے خواب میں دیکھا۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں "قطب الدین سے ہمارا سلام کہو اور یہ کہ وہ جو ہدیہ بھیجا کرتے تھے وہ تین دن سے نہیں ملا کیا بات ہے؟"

آپ پر اس خواب کا اتنا اثر ہوا کہ زوجہ محترمہ سے مفارقت اختیار کرلی۔ دوسرا نکاح غالباً (کچھ زمانے کے بعد دہلی آکر کیا)۔ زوجہ ثانیہ کے بطن مبارک سے دو جڑواں بچے پیدا ہوئے ان میں سے ایک کا نام محمد تھا طفولیت ہی میں کسی بیماری سے گذر گئے۔ جب آپ کے کانوں میں بچے کی ماں کے رونے کی آواز پڑی تو دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ معلوم ہوا کہ فرزند کی رحلت پر رو رہی ہیں تو آپ کو بہت رنج ہوا اور فرمایا مجھے افسوس ہیکہ خدا سے اس بچے کی زندگی مانگنا یاد نہ آیا ورنہ یقین ہیکہ خدا اسے ضرورت سلامت رکھتا۔ آپ کے دوسرے صاحبزادے کا نام احمد تماجی بتایا جاتا ہے اور حضرت خواجہ نظام الدین کا بیان ہیکہ یہ اپنے والد محترم کے رنگ پر بالکل نہ تھے۔ نہ انھیں قطب صاحب کے احوال باطنی سے کچھ نسبت تھی۔ ان کا مزار قطب صاحب کے پائنتی کی جانب ہے۔ درر نظامی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہیکہ خواجہ احمد تماجی کی یہ خواہش تھی کہ وہ قطب صاحب کے سجادہ نشین ہوں مگر قطب صاحب نے وصیت فرمائی کہ میرا سجادہ شیخ فرید الدین مسعود کو بنایا جائے ان سے ہمارا سلسلہ آگے چلے گا۔

قطب صاحب نے اپنا جامہ مبارک جو شیخ فرید الدین کو مرحمت فرمایا تھا وہ حضرت نظام الدین اولیاء نے دیکھا تھا اور ایک مجلس میں فرمایا کہ " دوتائی بود سوزنی " (فوائد الفواد) امروہہ کے فریدی خاندان میں حضرت بابا فرید کے وہ تمام تبرکات ابھی تک محفوظ ہیں اور گمان غالب یہ ہیکہ ان میں وہ جامہ خلافت بھی شامل ہے۔

جب قطب صاحب کی رحلت ہوئی اس وقت بابا فرید ہانسی میں مقیم تھے۔ دلی سے ایک آدمی انھیں بلانے کو بھیجا گیا مگر اس سے پہلے ہی حضرت بابا فرید کو ایک خواب میں یہ مکشوف ہوا کہ میرے مرشد کی رحلت ہوگئی ہے۔ آپ فوراً وہاں سے دلی کیلئے روانہ ہوگئے اور یہاں سے گیا ہوا قاصد آپ کو قصبہ سَمّ (ہریانہ) میں ملا۔ تیسرے دن آپ دلی پہنچے اور شیخ کے سجادہ بن بیٹھے۔ حضرت قطب صاحب کی عمر 53 سال دو ماہ اور 14 دن بتائی گئی ہے (تاریخ خان جہانی اور لطائف اشرفی) اسی سال حضرت خواجہ معین الدین اجمیر سے دلی تشریف لائے تھے اور ابھی وہ اجمیر واپس بھی نہ پہنچے تھے کہ قطب صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس سے پانچ ماہ کے بعد ہی 6/ رجب 634ھ کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے بھی اجمیر میں رحلت فرمائی۔

حضرت بابا فرید کو یہ شرف حاصل ہیکہ انھیں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ نے اور دادا پیر حضرت خواجہ غریب نواز نے وقت واحد میں بیعت و خلافت سے سرفراز فرمایا اور اس طرح بابا صاحب حضرت غریب نواز کے بھی راست جانشین ہوئے۔ حضرت بابا فرید نے پاک پٹن میں قیام فرماکر خلق خدا کو اپنا روحانی فیضان پہنچایا اور آپ کی خانقاہ غریبوں اور دکھی انسانوں کی ایسی پناہ گاہ بن گئی جہاں آدھی رات تک آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ حضرت بابا فرید کے جانشین حضرت نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی بدولت یہ فیضان ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گیا۔

حضرت قطب صاحب کے بہت سے خلفاء تھے۔ حضرت بابا فرید مسعود گنج شکر تو آپ کے سجادہ نشین ہوئے۔ چند دوسرے ممتاز خلفاء میں شیخ بدر الدین غزنوی (وفات 657ھ) تھے جو انتقال کے وقت قطب صاحب کے پاس موجود تھے۔ شیخ محمود نہروالی پٹن (گجرات) میں مدفون ہیں۔ وہیں ایک اور خلیفہ شیخ حامد الدین احمد نہروالی بھی ہیں۔ شیخ معز الدین دہلوی قاضی سعد، قاضی عماد اور شیخ وجیہہ الدین یحیی کا شمار بھی قطب صاحب کے خلفاء میں ہوتا ہے۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کثرت سے اور سخت مجاہدات کرتے تھے۔ اپنے زمانے میں ترک و تجرید اور آزادی و تفرید میں آپ کا جواب نہیں تھا۔ تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ آپ " نفس گیرا " رکھتے تھے۔ یعنی جو زبان سے فرماتے تھے وہی ہوجاتا تھا۔ مشغولی باطن کا یہ حال تھا کہ بقول حضرت خواجہ برہان الدین غریب " شیخ الاسلام قطب الدین کو سخت مشغولی تھی۔ ہمیشہ مراقبے میں رہتے تھے اگر کوئی ملنے والا آتا تھا تو خادم آپ کو مشغولی سے لیے نکالتے تھے جیسے کسی سوئے ہوئے کو جگایا جاتا ہے۔ آپ کا چہرہ مبارک بھی ایسا ہی نظر آتا تھا (جیسے سوتے سے اٹھے ہیں)۔ آنے والوں سے دو ایک نصیحت آمیز باتیں کرتے پھر فرماتے " خیرباد "۔ اگر تمھارا جی چاہے بیٹھو ورنہ جاسکتے ہو "۔ پھر مراقبے میں چلے جاتے تھے۔ خدام آنے والوں کو خرما یا روٹی اور پھول دے کر رخصت کرتے تھے۔ البتہ حضرت کا دسترخوان (لنگر) نہیں تھا۔ دسترخوان کی رسم ہمارے حضرت (خواجہ نظام الدین) سے شروع ہوئی ہے۔ اگرچہ شیخ الاسلام فرید الدین کا بھی دسترخوان (عام) تھا۔ لیکن ہمارے حضرت (نظام الدین) کو اس میں غلوے تمام تھا " (نفائس الانفاس قلمی 27/ ذی قعدہ 732ھ)۔

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمۃ سے کسی مرید نے عرض کیا کہ خواجہ قطب الدین کے ہاں " کاسہ و کندوری " (لنگر) تھا یا نہیں؟ انھوں نے فرمایا " نہیں۔ لنگر نہیں تھا۔ ان کی زندگی بہت عسرت میں گذرتی تھی۔ ایک مسلمان بقال شرف الدین نامی آپ کا پڑوسی تھا ابتداء میں خواجہ اس سے قرض لیا کرتے تھے اور اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب تمھارا قرض تین سو درہم سے زیادہ ہوجائے تو قرض دینا بند کردیا کرو۔ جب کہیں سے فتوح آتی تھی تو اس کا قرض ادا کردیتے تھے۔ لیکن پھر خواجہ قطب صاحب نے اپنے آپ عہد کرلیا تھا کہ آئندہ کسی سے قرض نہیں لیں گے۔ اس وقت سے بہ فضل خدا روزآنہ ایک روٹی مصلے کے نیچے سے ملنے لگی جو سارے گھر کو کافی ہوجاتی تھی۔ اس وقت گھر میں نو افراد تھے جن کی کفالت قطب صاحب کے ذمہ تھی (تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی) بقال نے یہ سمجھا کہ شاید شیخ مجھ سے ناخوش ہیں جو قرض لینا چھوڑ دیا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کو شیخ صاحب کے گھر میں بھیجا تاکہ وہ حال دیکھ کر آئے۔ حضرت خواجہ کی اہلیہ محترمہ نے اسے بتادیا کہ روزانہ ایک روٹی ہمیں مل جاتی ہے۔ جو سارے گھر کیلئے کافی ہوتی ہے۔ یہ اظہار کرنے کے بعد سے وہ کاک ملنی بند ہوگئی۔ حضرت شیخ نے اہلیہ محترمہ سے دریافت کیا کہ کیا انھوں نے کاک ملنے کا حال کسی کو بتادیا

ہے ؟ انھوں نے عرض کیا۔ جی ہاں میں نے بقال کی بیوی سے کہہ دیا تھا"۔

حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ حضرت شیخ معین الدین حسن سجزی قدس سرہ نے خواجہ قطب الدین بختیار کو پانسو درہم تک قرض لینے کی اجازت دے رکھی تھی (سیرالاولیاء 59) جب ان کو روحانی کمالات میں ترقی ہوتی گئی تو وہ قرض لینا بھی چھوڑ دیا تھا چنانچہ آپ کیلئے کبھی بستر نہیں بچھایا جاتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جب نیند کا بہت غلبہ ہوتا تھا تھوڑی دیر کو سوجاتے تھے آخر میں وہ بھی ترک کردیا تھا اور فرماتے تھے کہ اگر میں ذرا دیر کو بھی سوجاتا ہوں تو بیمار ہوجاتا ہوں۔ اس مشغولی کے باوجود آپ نے دلی آنے کے بعد خاصی پختہ عمر میں قرآن شریف حفظ کیا اور روزآنہ ایک یا دو ختم کرلیا کرتے تھے (سیرالعارفین ص 30)۔

غرض ہندوستان کی سرزمین میں چشتی برکات کا جو پودا حضرت غریب نواز نے لگایا تھا اس کی آبیاری حضرت قطب صاحب نے کی اور حضرت بابا فرید کے عہد میں وہ ایک چھتنار درخت بن گیا جس کے سایے میں خلق خدا کو راحت ملی۔ پھر حضرت محبوب الٰہی کے زمانے میں اس کے پھل ہی عام لوگوں تک نہیں پہنچے بلکہ اس کی قلمیں بھی دور دور تک لگ گئیں جن کا فیض ہمیں اور آپ کو بھی مل رہا ہے۔

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ کی مبارک زندگی میں آج بھی ہمارے لئے بہت سے سبق موجود ہیں وہ ایک شمع ہے جو آج بھی ہمیں راستہ دکھا رہی ہے۔ یہ راستہ انسان دوستی بیکس نوازی اور غریب پروری کا ہے۔ صوفیہ کا قول ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے، خدا سے محبت کرنے والا یہ نہیں کرسکتا کہ اس کے کنبے کے ایک فرد سے محبت کرے اور دوسرے سے نفرت کرے۔ شیخ سعدی نے صوفیہ کے فلسفۂ انسان دوستی کو دو تین شعروں میں بڑی خوبی سے بیان کردیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یک دیگر اند
کہ در آفرنیش زیک جوہر اند
جو عضوے بدرد آورد روز گار
دگر عضو ہارا نماند قرار
توکز محنتِ دیگر ان بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

(ترجمہ، تمام انسان ایک دوسرے کے اعضا ہیں یعنی ایک دوسرے کے کام آنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور ان کی پیدائش بھی ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے جسم کا اگر ایک انگ درد میں مبتلا ہوتا ہے تو دوسرے اعضا کو بھی بے چینی رہتی ہے۔ تم اگر دوسروں کی تکلیف کا غم نہیں کرتے تو انسان کہلانے کے مستحق نہیں ہو۔) حضرت بابا فریدؒ کے پاس دنیا کی دولت کے ڈھیرے نہیں تھے۔ نہ کوئی بڑا عہدہ یا اقتدار تھا نہ کچھ اور ایسے وسائل تھے جن سے سماجی پوزیشن مضبوط ہوتی ہے اور انسان اس قابل ہوتا ہے کہ دوسروں کی مدد کرسکے مگر انھوں نے اس کامل فقر اور بے

سروسامانی کے عالم میں رہ کر بھی خلق خدا کی اتنی خدمت کی کہ بڑی بڑی سلطنتیں رکھنے والے بھی نہیں کر سکے۔

حضرت بابا صاحب سوز مجسم تھے اور یہ تپش دوگونہ تھی ایک طرف محبت ہی کی آگ جو ما سوا کو جلاکر بھسم کردیتی ہے اور جسے شاعر نے یوں کہا ہے:

لکڑی جل کولا بھیو، کولا جل بھیو راکھ

میں پاپن کچھ یوں جلی کولا بھئی نہ راکھ

دوسری طرف پسماندہ، مفلوک الحال اور درماندہ انسانوں کا غم تھا جو ایک درد بن کر سارے وجود میں سرایت کرگیا تھا۔ بابا صاحبؒ کی مبارک زندگی کے چند واقعات سے ان کی انسان دوستی، غریب پروری اور بیکس نوازی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اجودھن میں دو بھائی دونوں سرکاری دفتر میں لشکری یا کلرک تھے ایک بھائی جس کا نام محمد شاہ غوری تھا ذکر و شغل کا ذوق پیدا ہوا تو اس نے نوکری سے استعفا دے دیا اور اپنے بیوی بچوں کی دیکھ بھال اپنے بھائی کو سونپ دی خود حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں آکر انکا مرید ہوگیا اور خانقاہ میں رہنے لگا کچھ دنوں بعد اسکا بھائی سخت بیمار ہوا، بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ یہ زار زار روتا ہو بابا صاحبؒ کی خدمت میں آیا۔ حضرت نے دریافت فرمایا، کیوں روتے ہو؟ کیا ہوا؟ عرض کیا میرا ایک بھائی ہے وہ میرے گھر بار کی دیکھ بھال مجھ سے بھی اچھی کر رہا تھا اور میں دل جمعی کے ساتھ ذکروشغل میں مصروف تھا۔ اب وہ مر رہا ہے، میں اسے جان کنی کے عالم میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ اب مجھ سے عبادت وریاضت، ذکروشغل کچھ نہ ہوسکے گا، بیوی بچے کہیں گے ہمارے کھانے کو لاؤ تو مجھے فکر معاش میں سرگرداں ہونا پڑے گا۔

بابا صاحبؒ نے فرمایا، محمد شاہ جو کیفیت اس وقت تمہاری ہے، محبت حق تعالی میں میرا ہمیشہ یہی حال رہتا ہے مگر میں کسی سے کہتا نہیں۔ جاؤ تمہارا بھائی تندرست ہوگیا وہ کھاٹ پر بیٹھا ہوا حریرہ پی رہا ہے"۔ محمد شاہ نے گھر آکر دیکھا تو اپنے بھائی کو صحت مند پایا۔

قاضی حمید الدین ناگوری کے ایک پوتے شرف الدین تھے وہ ناگور (راجستھان) میں رہتے تھے۔ ایک بار انھیں خیال ہوا کہ اجودھن جاکر حضرت بابا صاحبؒ سے بیعت کریں۔ اس نیت سے ناگور سے روانہ ہوئے۔ ان کی ایک کنیز تھی جو کم و پیش سو تنکے (اس زمانے کا سکہ) میں خریدی تھی۔ اس کنیز نے چلتے وقت کہا کہ آپ اجودھن میں حضرت بابا فریدؒ کی خدمت میں حاضر ہوں تو اس باندی کا بھی ان سے سلام کہہ دیں۔ اس نے اپنے ہاتھ سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی دستار بھی دی کہ یہ میری طرف سے شیخ کو ہدیہ کر دیں۔ جب شرف الدین اجودھن آئے اور حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھیں دھیان آیا کہ میری باندی نے بھی حضرت کے لئے ایک ہدیہ بھیجا تھا اور سلام عرض کیا تھا۔ انہوں نے کہا، مخدوم، میری ایک باندی ہے وہ ناگور میں ہے اس نے آپ کے لئے یہ دستارچہ نذر بھیجا تھا اور سلام عرض کیا تھا۔ بابا صاحبؒ نے اس کا ہدیہ قبول فرمایا اور زبان مبارک سے یہ الفاظ نکلے۔ "اللہ اس کو آزاد کر دے" مولانا شرف الدین نے بابا صاحبؒ کی مجلس سے اٹھ کر سوچا کہ شیخ نے اسے آزادی کی دعا دی ہے تو وہ ضرور آزاد ہو جائے گی۔ مگر قیمتی کنیز ہے، میں اسے فروخت کر دوں تو ممکن ہے خریدنے والا اسے کسی وقت آزاد کر دے۔ پھر خود ہی یہ بھی سوچا کہ اگر کنیز کسی دوسرے کے گھر جاکر آزاد ہوگی تو اس کا ثواب اسی شخص کو ملے گا۔ یہ ثواب دوسرا کیوں حاصل کرے؟ میں ہی کیوں نہ کروں؟ اسی وقت پلٹ کر بابا صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا، مخدوم کے صدقے میں اس کنیز کو میں اسی وقت آزاد کرتا ہوں، بابا صاحب نے فرمایا، جزاک اللہ (اللہ تمھیں اس کی جزا دے)۔

یہیں پاک پٹن کے پاس کسی گاؤں میں ایک تیلی رہتا تھا۔ علاقے کے زمیندار نے اس گاؤں کو لوٹا اور بہت سے لوگوں کو گرفتار کر لیا۔ اسیروں میں اس تیلی کی خوبصورت اور جوان بیوی بھی تھی جس سے وہ بہت محبت کرتا تھا۔ وہ عورت خدا جانے کہاں گئی، کسی کے ہاتھ لگ گئی۔ یہ شخص زار و قطار روتا ہوا اس کی تلاش میں ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔ آخر کار حضرت بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں آیا اور رونے لگا۔ حضرت نے پوچھا، کیوں رو رہے؟ اس نے سارا ماجرا بیان کیا اور کہا کہ میری بیوی مجھے نہ ملی تو میں بھی زندہ نہیں رہوں گا۔ حضرت بابا صاحبؒ نے اپنے کسی خادم

کو اشارہ کیا کہ کھانا لاؤ، کھانا آیا تو آپ نے اس سے فرمایا لو پہلے تم کچھ کھاؤ۔ اس نے کہا: میں نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا ہے، حلق بالکل سوکھ گیا ہے مجھ سے کھایا ہی نہیں جائے گا۔ شیخ نے فرمایا: تم پریشان مت ہو اللہ کی بڑی قدرت ہے، کھانا کھاؤ۔ اس نے کھانا شروع کیا تو منہ میں نوالہ چلتا ہی نہ تھا۔ کہنے لگا: حضرت مجھ سے کھایا نہیں جائے گا۔ بابا صاحب نے فرمایا: تم تین دن میرے پاس رہو۔ اسے اتنی تاب بھی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے جیسے تیسے دو دن پڑا رہا۔ تیسرے دن سپاہی ایک محرر (کلرک) گرفتار کر کے لائے جو اجودھن کا متصرف تھا۔ وہ بابا صاحبؒ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے پوچھا: "تمھیں کیوں گرفتار کیا گیا ہے؟" اس نے کہا فلاں قصبے کے مقطع (حاکم) نے مجھے حساب فہمی کے لئے طلب کیا ہے اب خدا جانے وہاں جاکر میرا کیا حشر ہوگا؟ آپ دعا فرمائیں کہ میری گلو خلاصی ہوجائے۔ بابا صاحب نے فرمایا: تم اطمینان رکھو جب وہاں پہنچو گے تو وہ تم پر عنایات کرے گا اور خلعت دے گا۔ مگر تم سے ایک کام میرا بھی ہے۔ اس نے کہا کہ اگر میری جان بخشی ہوگئی تو سارا گھر بار آپ کے خادموں پر قربان ہے، آپ حکم دیں کیا خدمت ہے؟ بابا صاحب نے فرمایا "جب تم مقطع کے پاس پہنچو گے وہ تم کو انعام دے گا اور ایک کنیز بھی بخشے گا اسے تم اس تیلی کے حوالے کر دینا۔" اس شخص نے بسرو چشم قبول کیا۔ وہ روغن فروش بھی وہاں موجود تھا یہ سن کر رونے لگا اور کہا کہ حضرت میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے میں ایک نہیں پچاس کنیزیں خرید سکتا ہوں، مگر مجھے کنیز نہیں اپنی بیوی چاہیے۔" بابا صاحب نے فرمایا: "تم اس کے ساتھ جاؤ تو" وہ بادل ناخواستہ ساتھ ہولیا۔ جب وہاں پہونچا تو مقطع نے حکم دیا کہ محرر کی ہتھکڑیا کھول دیں اور میرے سامنے حاضر کریں۔ وہ آیا تو اس سے کہا کہ جاؤ تم نہا دھو کر لباس تبدیل کرو۔ اسے سزا دینے کے لئے ایک جگہ شکنجہ گاڑ رکھا تھا وہ تیلی اس شکنجے کے پاس بیٹھا روتا رہا۔ مقطع نے اس محرر کے لئے نیا لباس بھیجا اور کہا کہ فلاں کنیز کو جامۂ خواب پہنا کر اس کے پاس بھیج دو۔ کہنا کہ یہ تمہارے لئے بخشش ہے۔ جب فراش اس کنیز کو لے کر محرر کے پاس آیا تو روغن فروش کی اس پر نظر پڑی، قد اور رفتار سے بھی اسے پہچان لیا، دوڑ کر اس عورت کے قدموں کو لپٹ گیا اور دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ لوگوں نے پوچھا: کیا ہوا؟ کہنے لگا میں اسی کی طلب میں تو مارا مارا پھر رہا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے۔ محرر نے کہا: میں نے حضرت بابا فریدؒ سے وعدہ کیا

تھا۔ یہ کنیز اس روغن فروش کو دے دی جائے۔ جب یہ قصہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ نے اپنی مجلس میں بیان فرمایا اس وقت تمام حاضرین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

ایک اور صاحب شاید اسی علاقے اجودھن کے رہنے والے تھے۔ حضرت بابا صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ میری اولاد میں فقط لڑکیاں ہیں اور ان کی شادی کے لئے میرے پاس کچھ نہیں۔ آپ میرے لئے کچھ کریں۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا: "صبر کرو" اس شخص نے کہا: "شیخ اگر آپ کی ایک کنواری بیٹی گھر میں بیٹھی ہوتی تو آپ کو میرے حال کا اندازہ ہوتا" اس شخص کی پانچ یا چھ بیٹیاں تھیں۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا: بتاؤ میں کیا کروں؟ اس نے کہا "آپ مجھے کسی (امیر) کے سپرد کر دیجئے۔ اتفاق سے ظفر خان نامی ایک امیر آگیا، یہ علاؤالدین خلجی کا عارض ممالک (وزیر جنگ) تھا۔ بعد کے زمانے میں دہلی کے قریب منگولوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوگیا تھا۔ بابا صاحب نے اس سے فرمایا کہ اس شخص کی امداد کرے۔ اس نے کہا: میرے گھر میں مہمان خانہ موجود ہے ان سے فرما دیجئے وہاں آجائیں اور رہیں۔ شیخ نے فرمایا: "مولانا جاؤ" یہ ساتھ ہولئے اور پھر خوش حالی سے گذر ہونے لگی۔

بابا صاحبؒ کی خانقاہ میں صبح سے شام تک ایسے ہی خستہ دل، پریشان حال، پراگندہ روزی اور دکھوں کے مارے ہوئے انسان آتے تھے۔ ان میں امراء بھی ہوتے تھے علماء اور درویش، قلندر اور جوالقی سپاہی اور تاجر، مزدور اور اہل حرفہ بھی مگر سماج کے کمزور ترین اور پس ماندہ انسانوں کی تعداد ہی زیادہ ہوتی تھی۔ حضرت نظام الدین اولیاؒ نے فرمایا کہ خانقاہ کا دروازہ رات کو دیر گئے بند ہوتا تھا اور آدھی رات تک آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ بابا صاحبؒ ہر آنے والے سے ملتے تھے اور ہر ایک کا دکھ درد بانٹ لیتے تھے۔ ہر ایک کے مناسب حال اس کا مداوا فرماتے تھے کسی کو تعویذ لکھ کر دے دیا کسی کو پڑھنے کے لئے کوئی وظیفہ بتادیا۔ شروع زمانے میں جب حضرت نظام الدینؒ شہر دہلی میں رہتے تھے اور پہلی بار اجودھن جارہے تھے ان کے ایک پڑوسی نے جس کا نام محمد تھا اور اسے ہر سال نارو کی بیماری ہوجاتی تھی جس میں رشتہ نکلتا رہتا ہے، اس نے حضرت نظام الدینؒ سے درخواست کی کہ میرے لئے بابا صاحبؒ سے تعویذ لیتے آنا۔

حضرت نظام الدینؒ کو اجودھن میں اس کی فرمائش کا دھیان آیا تو انھوں نے بابا صاحب سے عرض کیا۔ فرمایا: "تم ہی لکھ لو" حضرت نظام الدین نے تعویذ لکھ کر بابا صاحب کے دست مبارک میں دیا آپ نے اسے ایک نظر دیکھا اور یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ دہلی جاکر اپنے پڑوسی کو دے دینا۔ حضرت نظام الدین نے دہلی واپس آکر وہ تعویذ دیا تو پھر تمام عمر اسے نارو کی بیماری نہیں ہوئی۔ حضرت بابا صاحبؒ نے اپنے پیر و مرشد خواجہ قطبؒ صاحب سے عرض کیا تھا کہ لوگ مجھ سے تعویذ مانگنے آتے ہیں، آپ کا کیا حکم ہے؟ کیا لکھ کر دے دیا کروں؟ قطب صاحبؒ نے فرمایا: کام نہ تمھارے بس میں ہے نہ میرے اختیار میں اور تعویذ اللہ کا نام ہے اللہ کا کلام ہے، جو مانگے لکھ کر دے دیا کرو"۔

اس لئے بابا صاحب طالبوں اور حاجتمندو کو تعویذ بھی لکھ کر دے دیا کرتے تھے اکثر تعویذ لینے والوں کی خاصی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی، حضرت بدر اسحاقؒ کے ذمہ یہ بھی تھا کہ وہ تعویذ لکھ کر بابا صاحب کی خدمت میں پیش کرتے تھے اور بابا صاحبؒ اسے اپنے ہاتھ سے مس کر کے اہل حاجت کو دے دیتے تھے۔ ایک بار حضرت بدر اسحاق موجود نہیں تھے، بہت سے تعویذ لینے والے جمع ہو گئے۔ بابا صاحبؒ نے حضرت نظام الدینؒ سے فرمایا کہ تم لکھو۔ یہ لکھتے رہے۔ لکھتے لکھتے انگلیاں شل ہوگئیں، بابا صاحبؒ نے ان کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا تھک گئے؟" انھوں نے عرض کیا کہ مخدوم بہتر جانتے ہیں۔ بابا صاحبؒ نے فرمایا میں تمھیں تعویذ لکھنے کی اجازت دیتا ہوں جو کوئی مانگے اسے دے دیا کرو۔

یہ تعویذ وغیرہ تو عام انسانوں کی پریشانیاں دور کرنے کے لئے آپکی ہمت مصروف کرنے کا بہانہ تھا۔ بابا صاحبؒ اپنی خانقاہ میں رہنے والوں کی اخلاقی حالت سدھارنے اور ان کے باطن کو روشن بنانے کی طرف خاص دھیان دیتے تھے اس کا اندازہ ان تعلیمات سے ہو جاتا جو کبھی اپنے عمل سے کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی واضح الفاظ میں وہ اپنے زیر تربیت مریدوں کو دیتے رہتے تھے۔ جب حضرت نظام الدین اولیاءؒ پہلی بار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے تو بابا صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ "اپنے مخالفوں کو خوش کرنا چاہیے اور جو حق جس کا ہو اسے دینا چاہیے" اسی طرح

آپ صبر و ضبط اور اور عفو در گذر کی تعلیم دیتے تھے اور فرماتے تھے کے کشندہ بود؛
یعنی جو برداشت کرلیتا ہے وہ گویا اپنے دشمن کو ڈھیر کردیتا ہے۔ آپ ہر شخص کا عذر بھی قبول
فرمالیتے تھے اور کسی سے بد گمان نہ ہوتے تھے۔ فرماتے تھے کہ جاہل آدمی کو زندوں میں مت گنو۔
ایسا سچ بھی مت بولو جو جھوٹ سے ملتا جلتا ہو۔ جس متاع کا کوئی خریدار نہ ہو اسے بیچنے مت نکلو۔
دنیا کی نمود اور دولت کے لئے خطرے مول مت لو۔ ہر ایک کی روٹی مت کھاؤ مگر خود ہر ایک کو
کھلاؤ۔ موت کو کسی وقت مت بھولو۔ اٹکل سے باتیں مت کہو۔ جو بلا آئے اسے اپنی خواہشات کا
نتیجہ سمجھو۔ اگر گناہ کیا ہے تو اس پر ڈینگ مت مارو۔ اپنے باطن کو اپنی ظاہری حالت سے اچھا بنا کر
رکھو۔ ہر ایک کا احسان مانو مگر خود کسی پر احسان مت رکھو۔ دل جس چیز کی برائی پر گواہی دے
اس سے فوراً ہاتھ کھینچ لو۔ نیکی کرنے کے لئے بہانے تلاش کرو۔ کسی سے پوری لڑائی نہ کرو صلح کے
لئے گنجائش چھوڑ دو۔ کسی دشمن سے بے خوف نہ رہو۔ یہ سمجھو کہ اصلی عزت اور حشمت انصاف
کرنے میں ہے۔ مال و دولت ہے تو حوصلہ بلند رکھو۔ کسی چیز کو وقت کا بدل مت سمجھو۔ مہمانوں
سے تکلف کا برتاؤ نہ کرو۔ دشمن کو تدبیر سے اور دوست کو تواضع سے رام کرو۔ اپنے عیبوں کو دیکھا
کرو۔ اگر چاہتے ہو کہ رسوائی نہ ہو تو خوشامد مت کرو۔ آسودگی چاہتے ہو تو حسد مت کرو۔ ایسے کام
کرو کہ مرنے کے بعد زندہ رہو۔

یہ ان ہزاروں لاکھوں قیمتی ملفوظات اور نصیحتوں میں سے چند بطور نمونہ ہیں جو بابا
صاحبؒ اپنے مریدوں اور حاضر باش عقیدت مندوں سے فرماتے تھے۔ لیکن اجودھن جہاں آپ کا
قیام تھا ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جو تہذیبی مرکزوں سے کوسوں دور تھا اور یہاں کے باشندے زیادہ
تر ان پڑھ اجڈ اور محنت مزدوری کرنے والے لوگ تھے بابا صاحبؒ ان کی تعلیم و تربیت سے بھی
غافل نہ تھے اور ایسی عام فہم زبان میں سیدھے سچے دل میں اتر جانے والے اسلوب میں ان کو
نصیحت کرتے تھے۔ جو ان کی روز مرہ کی زندگی اور مشغلوں اور مشاہدوں سے حاصل کیے ہوئے
استعاروں سے لی جاتی تھیں۔ بابا صاحبؒ ہر شخص سے اس کی لیاقت اور استعداد کے موافق گفتگو
فرماتے تھے اور اخلاقیات، مذہب، تصوف، یا روحانیات کے نہایت باریک مضامین بھی میٹھی اور

ان زبان میں بیان فرمادیتے تھے۔ اس مقصد کے لئے صوفیوں نے شاعری کا سہارا بھی لیا ہے کہ
ں میں بڑا وسیع مفہوم چند الفاظ میں سما جاتا ہے اور اسے یاد رکھنے میں بھی سہولت ہوتی ہے۔
بتر صوفیہ نے عوام کی اصلاح اور نصیحت کے لئے ہندوی دوہوں کا سہارا لیا کہ یہ عوام کی اپنی
لی میں ہوتے اور کسی دشواری کے بغیر ان کی سمجھ میں آجاتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے
ریم کلام جو ہندوستانی زبان میں ہے وہ حضرت بابا فریدؒ کا ملتا ہے۔ ان کے ایک سو تیس اشلوک
ر چار شبد مقدس گرنتھ صاحب میں شامل ہیں۔ یہ ملتانی پنجابی کا وہ کلام ہے جو گرونانک مہاراج کو
کپٹن کے سفر میں ملا تھا اور انھوں نے ایک صوفی کے ان حکمت بھرے اقوال کی ایسی قدر کی
ہ اس کلام کو گرنتھ صاحب کا ایک حصہ بنادیا۔ اس پنجابی کلام کے مستند ہونے میں شبہ کرنے کی
بخائش نہیں ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس میں اسلامی تعلیمات کے خلاف ایک لفظ بھی
نہیں ہے، دوسرے بعض حضرات یہ شبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے فارسی مصادر سے اس کلام کی
تائید نہیں ہوتی۔ اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ضروری نہیں فارسی مصادر میں ہر بات لازما
مل جائے اور دوسرے یہ کہ بابا صاحب کا پنجابی اور ہندوی کلام فارسی مصادر میں بھی ملتا ہے۔
چوتھی بات یہ کہ اس کلام کی ملکیت کا اور کوئی دعویدار آج تک سامنے نہیں آیا ہے۔ یہ ہمیں
پورے وثوق سے معلوم ہے کہ بابا صاحب فارسی، عربی، ہندوی اور پنجابی کا بہترین ادبی ذوق رکھتے
تھے اور ان زبانوں میں کبھی کبھی اشعار بھی موزوں کرتے تھے۔ شمائل الاتقیاء ایک قدیم تصوف
کی کتاب ہے جو حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ حضرت برہان الدین غریبؒ کی فرمائش پر ۷۳۷
ہجری (۱۳۳۶ء) میں لکھی گئی تھی اس میں بابا صاحب کے دوہے کی ایک پنکتی ملتی ہے۔ "جس کا
سائیں جاگت سو کیوں سووے سکھ"، بعض نسخوں میں یوں ہے: جس کا سائیں جاگتا ہو کیوں
سووے داس۔ علی اصغر ہرالوی کی جواہر فریدی ۱۶۲۲ء کی تالیف ہے اس میں بابا صاحبؒ کے دو
دوہے نقل ہوئے ہیں۔

فرید ادھڑسولی سر پنجرے ٹمیا رنڈ کاگ

رب اجیوں نباہڑئے سودھن ساڈے بھاگ

دوسری روایت اس کی یوں بھی ہے:

فرید اتن ٹکا ہنجر تھیاتلیاں کھونڈے کاگ
ابھے سورت نہ باہوڑیہو دیکھ بندے کے بھاگ

دوسرا دوہا یہ ہے:

توپی لینڈلے باورے دینڈے کھرے نلج
چوہا بل نا مانوسے پیچھے بندتے چھج

یعنی جو مرید ہو کر کلاہ کسی سے لیتے ہیں وہ باولے ہیں اور جو کلاہ ارادت دیتے ہیں وہ نرے بے شرم ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ چوہا خود تو بل میں سما نہیں رہا اوپر سے اپنی دم میں ایک چھاج بھی باندھ لیا۔ یعنی پہلے اپنی بخشش کا یقین ہو تو کسی دوسرے کا ہاتھ تھامے۔

پنجابی زبان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کے سب سے پہلے معلوم شاعر حضرت بابا فرید الدینؒ گنج شکر ہیں اور پنجابی شاعری کا قدیم ترین نمونہ حضرت بابا صاحبؒ کا کلام ہے۔ عوام کی سمجھ بوجھ کو دیکھ کر وہ ایسے آسان اور دل نشین انداز میں تلقین کرتے ہیں کہ ایک بالکل بے پڑھا لکھا اور اجڈ انسان بھی ان کے مفہوم کو پاسکتا ہے۔ مثلاً وہ یہ تلقین کرتے ہیں کہ اس زندگی کو بے کار نہیں گنوانا چاہیے بلکہ آنے والی زندگی یعنی آخرت کے لئے بھی کچھ سرمایہ اچھے اعمال کا جمع کرلینا چاہیے اس بات کو ان لفظوں میں کہا ہے:

بیڑا بندھ نا ساکیو بندھن کی بیلا
بھر سر دور جب اوچھلے تب ترن دوہیلا

جن لوگوں کی روز مرہ زندگی اور کاروبار دریا اور دریائی سفر سے تعلق رکھتے ہوں وہ اس تشبیہ کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور ان پر اس کا بھرپور اثر ہوسکتا ہے۔ پاک پٹن دریائے ستلج کے کنارے بسا ہوا ہے، یہ دریا برسات میں اتنا بھر جاتا تھا کہ بعض مقامات پر اس کا پاٹ دس میل چوڑا ہوتا تھا، اس لئے دریا کے اس پار سے کاروبار کرنے والے برسات آنے سے پہلے ہی اپنے

بیڑے اور ناویں تیار کر کے رکھتے تھے۔ اتنا ہی نہیں کہ بابا صاحبؒ نے روحانی اور اخلاقی تعلیم کے لئے شاعری کا اور اپنی علاقائی بولی کا استعمال کیا بلکہ آپ کا اچھوتا کارنامہ یہ بھی ہے کہ عوام کو عربی الفاظ کی بجائے پنجابی زبان میں ذکر جہر کی تلقین فرماتے تھے بہت سے قدیم مصادر سے ذکر ہندوی خاصہ حضرت بابا فرید گنج شکر کا تذکرہ ملتا ہے۔ انھوں نے پنجابی میں یک ضربی ،دو ضربی، سہ ضربی، پنج ضربی ذکر کی تعلیم دی مثلاً:

اِتھے توں اُتھے توں وا توں ہی توں

ایہہ وَل توں اوہ وَل توں توں ہی توں

بعد کے زمانے میں حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ اور حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی بھی عوام کو اس فریدی ذکر کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ مجھے بابا صاحبؒ کا کچھ اور پنجابی کلام بھی بہت پرانے ماخذوں میں ملا ہے جو ان کے زمانے کے بہت قریب کے ہیں مگر یہ فارسی رسم الخط میں ہے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی

(خانقاہ مبارک کی ایک جھلک)

دور نظامی کے مولف علی بن محمود جاندار نے حضرت نظام الدین اولیاء کے حالات و ملفوظات پر مشتمل ایک کتاب "خلاصۃ اللطائف" عربی زبان میں لکھی تھی جو اب ناپید ہے۔ مؤلف سیر الاولیاء نے اس کا ایک اقتباس لیا ہے اور اسی کو شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے "اخبار الاخبار" میں نقل کیا ہے۔ علی بن محمود کہتے ہیں۔ میں نے اپنے شیخ اور مخدوم سلطان المشائخ نظام الحق والدین قدس اللہ سرہ العزیز کو حالت مراقبہ میں دیکھا جب میں نے ایک بار کسی وقت ان کی مجلس میں داخل ہونا چاہا تو دیکھا کہ آپ بہت فراغت کے ساتھ بالکل ساکت بیٹھے ہیں اور بظاہر بدن میں قطعاً جنبش نہیں ہے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ہم نے اپنے آنے کی خبر دی مگر آپ نے ہمیں نہیں پہچانا پوچھا "تم کون ہو"۔ میں نے آپ کو استغراق کے اس عالم میں دیکھ کر الٹے پاؤں واپس ہونا چاہا تو آپ نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں مل کر مجھے دیکھا اور پہچان کر فرمایا "بیٹھو"۔ میں بیٹھ گیا تو آپ ہم کلام ہوئے۔ آپ کی آنکھیں اس طرح گردش کررہی تھیں جیسے نشے میں ہوں۔ فرمایا "گھر میں کیا کرتے رہتے ہو"۔ عرض کیا۔ "مخدوم نے جو شغل تعلیم کیا ہے وہی کرتا رہتا ہوں"۔ فرمایا "اللہ سے مشغولی پیدا کرو"۔ پھر فرمایا "فقیر کیلئے یہ مناسب ہیکہ اپنے دل میں ہر وقت یہ تصور رکھے کہ خدا اور رسول کے سامنے بیٹھا ہو" پھر فرمایا "جاؤ باہر جا کر ساتھیوں میں بیٹھو اس وقت مشغول ہوں"۔

حضرت کے مراقبے کی حالت کا ایسا ہی بیان بابا صاحب کے پوتے شیخ عزیز الدینؒ کا بھی ہے جسے مؤلف سیر الاولیاء نے نقل کیا ہے۔

دہلی میں جہاں آج کل ہمایوں کا مقبرہ ہے اس کے محاذ میں شمال کی طرف غیاث پور کی بستی تھی اور جنوب میں کیلو کھیڑی گاؤں آباد تھا۔ جاگیرداری نظام میں متوسط طبقہ برائے نام ہوتا تھا یا تو امراء ہوتے تھے یا پیشہ ور۔ غیاث پور ابتدا میں چھوٹا سا گاؤں تھا عام طور سے یہ غریب کسانوں اور مزدوروں کے گھر چھپر کے تھے مگر معزالدین کیقباد کے زمانے میں 686ھ (1287ء) کے لگ بھگ جمنا کے کنارے دور دور تک بادشاہ اور اس کے امیروں کے عالیشان محل بھی تعمیر ہوگئے تھے۔ جمنا اب مشرق کی طرف

بڑھ گئی ہے۔ اس وقت یہ اور مغرب میں تھی اس جگہ بستی تھی جہاں سے اب رنگ روڈ گذرتی ہے۔
حضرت نظام الدین ابتداء میں کسی کچے مکان میں آکر رہے تھے۔ بعد کو ضیاء الدین وکیل نامی ایک شخص نے جو حضرت کے مرید تھے عہد بلبن کے آخر میں ایک وسیع خطہ زمین پر ایک مضبوط اور کشادہ خانقاہ بنوا دی تھی۔ اس کا آنگن بہت بڑا تھا جس میں برگد اور پاکھر وغیرہ کے درخت بھی تھے۔ جماعت خانے میں دو صدر دروازے تھے ایک اندر جانے کیلئے دوسرا باہر آنے کیلئے۔ اسی لائن میں ایک کمرہ بھی تھا جس کے در شرق رویہ تھے۔ اور کھڑکیاں غرب رویہ۔ اس کمرہ کے سامنے ایک چبوترہ تھا اور اس سے نیچے اتر کر بڑا صحن جسے عبور کر کے جماعت خانے میں پہونچ سکتے تھے۔ جماعت خانے کی عمارت بہت سے ستونوں پر کھڑی تھی کیونکہ اس زمانے کے معمار پناؤ یا لنٹل کی بڑی چھتیں نہیں بناسکتے تھے۔ عمارت بڑی ہوتی تو اس کی چھت کو زیادہ ستون بنا کر تھامتے تھے اس جماعت خانے کا طرز تعمیر ایسا تھا جیسا حضرت امیر خسرو کے مزار کے سامنے حجرہ قدیم کی چھت کا انداز ہے یا جس طرح حضرت برہان الدین غریبؒ کے مزار واقع خلد آباد کا لنگر خانہ ہے۔

حضرت کی خانقاہ میں ہر ستون کے ساتھ طالبان خدا کے بستر لگے ہوئے تھے ان میں بعض ایسے تھے جن کی زندگی کا بہترین حصہ اس آستانے کی جاروب کشی میں بسر ہوگیا تھا اور کچھ وہ درویش ہوتے تھے جو دور دراز علاقوں سے اپنی روحانی پیاس بجھانے کیلئے آتے تھے۔ یہ جماعت خانہ کسی مسافر خانے کی طرح درویشوں سے کھچاکھچ بھرا رہتا تھا جگہ کی تنگی کی وجہ سے حضرت نظام الدینؒ نے ایک بار اپنے خلیفہ خاص حضرت نصیر الدین چراغ دہلی تک کو یہ ہدایت کردی تھی کہ وہ جماعت خانے میں دس دن سے زیادہ قیام نہ کریں حالانکہ وہ اجودھیا (موجودہ فیض آباد) سے چل کر اپنے پیرومرشد کی زیارت کرنے کو آیا کرتے تھے۔

اوپر کی طرف پندرہ سیڑھیاں چڑھ کر زینے کے دو دروازے تھے ایک بائیں حضرت کے حجرے میں لے جاتا تھا اور دوسرا اس کے سامنے داہنے ہاتھ کو بالاخانے کے صحن میں۔ تیسری منزل پر جانے کیلئے اسی زینے کی 9 سیڑھیاں اور چڑھنا ہوتی تھیں۔ حجرہ خاص کے دروازے کی دہلیز قدرے چوڑی تھی۔ اور کمرے کا فرش اس سے نیچا تھا جس پر آنے کے لیے ایک سیڑھی اترنا تھا۔ کمرے کے سامنے مشرق کی طرف پلنگ بچھا ہوا تھا جسے پر حضرت شب کو آرام فرماتے تھے اور اس حجرے کے پانچ در شمال کی

طرف کھلتے تھے۔ ایک بار امیر حسن دہلوی حاضر ہوئے جیسے ہی انھوں نے دروازے کی سیڑھی سے اتر کر سجدہ تعظیمی کیا حضرت نے فرمایا " وہیں سیڑھی پر بیٹھ جاؤ۔ اس وقت ہوا تیز چل رہی تھی اور دروازے کا ایک کواڑ بار بار ہوا کے زور سے بند ہوجاتا تھا۔ امیر حسن نے اس کواڑ کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ کچھ دیر اسی طرح ایک ہاتھ سے کواڑ پکڑے بیٹھے رہے۔ اچانک حضرت نے دیکھا تو فرمایا " کواڑ چھوڑ کیوں نہیں دیتے ؟ امیر حسن نے سر جھکا کر عرض کیا کہ " بندہ نے یہ در پکڑ لیا ہے۔ " حضرت اس پر معنی جملے پر مسکرائے اور فرمایا " ہاں پکڑ لیا ہے اور مضبوطی سے پکڑا ہے " ۔ پھر فرمایا کہ شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی کہا کرتے تھے ہر دری اور ہر سری مت بنو " ۔

" یک درگیر و محکم گیر "

حضرت عموماً سب کے ساتھ فرش پر تشریف فرما ہوتے تھے۔ ایک بار آپ پلنگ پر بیٹھے تھے اور سب حاضرین فرش پر تھے۔ آپ نے معذرت کی اور فرمایا کہ میری ٹانگ میں تکلیف ہے اس لیے فرش پر نہیں بیٹھ سکتا۔ حجرے میں لکھنوتی کے بوریئے بچھے ہوئے تھے۔ حضرت کے بائیں ہاتھ کو ایک کونے میں صراحی اور کوزے رکھے ہوتے تھے۔ اگر آرام کا وقت ہوتا اور امیر خسرو جیسے چند مخصوص لوگ حجرے میں ہوتے تو آپ پلنگ پر آرام فرما ہوتے تھے لحاف یا رضائی اس طرح اوڑھ لیتے کہ اس میں صرف چہرہ مبارک نظر آتا رہتا۔ خواجہ اقبال طاق میں سے تسبیح اٹھا کر آپ کی انگلیوں میں اٹکا دیتے۔

خانقاہ میں ظاہری آرائش کا سامان بالکل نہیں تھا، مگر ضرورت کا سب سامان تھا۔ ایک شخص درویشوں سے بہت اعتقاد رکھتا تھا کسی نے اس سے پوچھا کہ تم حضرت نظام الدین کے مرید کیوں نہیں ہوجاتے۔ اس نے کہا میں ایک دن وہاں بیعت کرنے کی نیت سے گیا تھا دیکھا تو وہاں نفیس کمخواب کے پردے پڑے ہیں۔ کافوری شمعیں روشن ہیں۔ یہ ٹھاٹھ دیکھ کر میرا دل ہٹ گیا اور واپس چلا آیا۔ یہ قصہ حضرت کے سامنے بیان ہوا تو آپ نے حاضرین سے پوچھا کہ یہاں جامہ ہائے کمخواب اور شمعیں کب تھیں ؟ " پھر مسکرا کر فرمایا کہ اس کی قسمت میں بیعت کی دولت نہیں تھی۔ اس لیے اسے یہ چیزیں دکھا دی گئیں۔ امیر حسن نے کہا کہ اگر جامۂ کمخواب اور شمعیں ہوں بھی تو ان سے کسی کا اعتقاد کیوں فاسد ہو ؟ حضرت نے فرمایا کہ بعض لوگوں کا اعتقاد ذرا سی بات سے خراب ہوجاتا ہے اور بعض کا اعتقاد بہت قوی ہوتا ہے " ۔

دلی میں ابتداء ہی سے آپ کا یہ معمول تھا کہ مہینے میں ایک بار حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار مبارک پر حاضری دیا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی تمام رات مزار کے پائینتی مراقبے میں بیٹھے رہتے تھے۔ ایک رات کو آپ زانو پر سر رکھے ہوئے مراقبہ میں بیٹھے تھے اچانک ایسی آواز آئی جیسے کوئی بہت خوش الحانی کے ساتھ قرآن شریف پڑھ رہا ہے۔ آپ نے سمجھا کہ یہ آواز حضرت قطب صاحب کے مزار سے آرہی ہے لیکن پھر غور سے سنا تو حضرت قطب صاحب کے مزار کے قریب جو قبر واقع ہے اس سے آرہی ہے۔

ایک بار آپ قطب صاحب کے مزار پر مراقبہ کررہے تھے اس وقت دل میں سوچا کہ حضرت کی روح تو عالم علوی میں ہے نہ جانے آپ کو میرے حاضر ہونے کی خبر بھی ہوتی ہوگی یا نہیں اسی وقت دیکھا تو قطب صاحب کی صورت مثالی سامنے تھی اور وہ فرما رہے تھے۔

مرا زندہ پندار چوں خویشتن

من آیم بجان گر تو آئی بتن

(مجھے بھی تم اپنی ہی طرح زندہ سمجھو۔ اگر تم جسمانی طور پر آتے ہو تو میں روحانی طور پر تمہارے پاس موجود رہتا ہوں)۔

قطب صاحب کی درگاہ میں آپ حضرت قاضی حمید الدین ناگوری اور قطب صاحب کے مزاروں کے درمیان بیٹھ کر نماز پڑھتے اور مراقبہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے کہ میں نے اسی مقام پر بہت لذت اور راحت پائی ہے۔ پھر فرمایا کہ جگہ میں کیا رکھا ہے اصل برکت تو ان دونوں بزرگوں کی ہے ورنہ آخر ادھر ادھر دونوں طرف بادشاہوں کے مقبرے بھی"۔ یہ بھی فرمایا کہ قطب صاحب کی درگاہ کبھی ابدال سے خالی نہیں رہتی۔

غیاث پور کی خانقاہ میں منتقل ہونے کے بعد بھی آپ قطب صاحب کی درگاہ میں حاضری دینے کیلئے بڑی پابندی اور اہتمام سے تشریف لے جاتے تھے۔ مریدوں اور خادموں کی ایک بڑی جماعت آپ کے ساتھ ہوتی تھی متعدد گاڑیوں میں جنس، غلہ، کپڑے اور نقدی وغیرہ رکھے جاتے جو راستے میں مسکینوں اور غریبوں کو تقسیم کیے جاتے۔ یہ کام خواجہ اقبال کے ذمہ تھا۔ راستے میں حضرت شیخ نجیب الدین متوکل اور حضرت کی والدہ ماجدہ کے مزارات بھی تھے وہاں فاتحہ پڑھتے ہوئے قطب

صاحب میں پہونچتے تھے۔ ایک محلہ ایسا پڑتا تھا جس میں طوائفین آباد تھیں وہ سب حضرت کی آمد کی سن گن پاکر اپنے حجروں سے باہر آبیٹھتی تھیں۔ خواجہ اقبال انھیں چاندی کا ایک ایک تنکہ دیتے چلے جاتے اور کہتے کہ حضرت تشریف لارہے ہیں تم سب پردے کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ یہ ان طوائفوں کا ایک طرح کا وظیفہ سا بندھ گیا تھا اور وہ حضرت کے اس راہ سے گذرنے کا انتظار کرتی رہتی تھیں۔

انتقال سے ایک دو ماہ پہلے ایکدن حضرت کے مرید علی بن محمود جاندار حاضر ہوئے تو حضرت نے فرمایا "آخر کیا سبب ہے لوگ میرے پاس قوالوں کو کیوں نہیں آنے دیتے"۔ علی بن محمود نے عرض کیا "بیماری کے سبب مخدوم کو بہت ضعف ہوگیا ہے۔ اس لیے قوالوں کو روک دیا جاتا ہے کہیں سماع سے ضعف اور نہ بڑھ جائے"۔ حضرت نے فرمایا "سماع کے وقت میرے اندر اتنی قوت ہوتی ہے جتنی اور کسی وقت نہیں ہوتی۔"

حضرت شمس الدین دامغانی جو حضرت کے ہم سبق بھی تھے کہنے لگے کہ بہت سے عقیدت مندوں نے پرتکلف اور عالیشان مقبرے بنوا رکھے ہیں تاکہ انھیں سے کسی عمارت کو حضرت کا روضہ بننے کی سعادت مل جائے۔ آپ اس بارے میں کیا وصیت فرماتے ہیں"۔ حضرت نے کہا "مولانا میں کسی کی عمارت کے نیچے سونے والا نہیں۔ میں تو صحراء میں سوؤں گا۔"

17/ ربیع الثانی 725ھ میں مطابق 20/ اپریل 1325ء کو بدھ کے دن صبح 7 بجے کے قریب رحمت بے کراں کے آغوش میں آسودہ ہوئے۔ یہ اس حیات ظاہری کے عارضی دور کا خاتمہ اور اس حیات معنوی کا آغاز تھا جس کا دامن ابد سے بندھا ہوا ہے۔

آخر میں وہ رباعی جسے 15/ محرم 710ھ کی مجلس میں آپ نے اپنی والدہ ماجدہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ایسی گلوگیر آواز میں پڑھا تھا کہ امیر حسن دہلوی اس کے دو مصرعے اچھی طرح سن بھی نہیں سکے تھے

افسوس دلم کہ ہیچ تدبیر نہ کرد
شبہائے وصال را بزنجیر نہ کرد
گر وصل تو یاری کند و یا نکند
بارے کہ فراق ہیچ تقصیر نہ کرد

حضرت نصیر الدین چراغ دہلیؒ

حضرت خواجہ نصیر الدین محمود اودھی جو عام طور پر حضرت چراغ دہلی کے لقب سے جانے جاتے ہیں، عہد تغلق کے نہایت عظیم المرتب صوفی تھے۔ ان کا خاندان کسی زمانے میں خراسان سے ہجرت کرکے لاہور آیا تھا، جہاں ان کے دادا شیخ یحییٰ پشمینے کی تجارت کرتے تھے۔ حضرت چراغ دہلی کے والد بزرگوار کا نام غالباً شیخ یوسف تھا۔ کسی وقت یہ خاندان اجودھیا میں آکر بس گیا اور یہیں حضرت چراغ دہلی کی ولادت 670 ہجری۔ 72۔ 1271ء کے بعد کسی سال میں ہوئی۔ ابھی ان کی عمر 9 سال کی ہی تھی کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ ان کی والدہ نے پرورش اور تربیت کی۔ بچپن ہی سے حضرت چراغ دہلی کا میلان عبادت و ریاضت کی جانب تھا۔ جوانی میں سخت مجاہدے کئے۔ اجودھیا کے باہر جنگلوں میں چلے جاتے تھے اور وہاں تنہائی میں اپنے رب سے راز و نیاز کرتے تھے۔ بھوک لگتی تو سنبھالو کے پتے کھالیتے تھے۔

جب آپ کی عمر 43 سال تھی ایک دن دہلی آنا ہوا اور یہاں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء علیہ الرحمہ کی خانقاہ میں ان کی قدم بوسی کا اشتیاق لے کر گئے۔ گرمی کا موسم تھا، دوپہر کا وقت ہوگیا تھا، یہ خانقاہ کے صحن میں بڑ کے درخت کے نیچے کھڑے سوچ رہے تھے کہ اس وقت شیخ کو تکلیف دینا مناسب نہ ہوگا۔ اتنے میں حضرت نظام الدین نیچے حجرے میں آرام فرمانے کیلئے بالا خانے سے اترے اور آپ کی نظر حضرت چراغ دہلی پر پڑی تو اپنے خادم خواجہ نصیر کو بھیج کر انھیں حجرے میں طلب فرمایا اور پوچھا کیوں آئے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا کہ درویشوں کی جوتیاں سیدھی کرنا چاہتا ہوں اور آپ کی صحت و سلامتی کا طالب ہوں۔ حضرت نظام الدین ان سے کچھ دیر باتیں کرتے رہے، بہت محبت اور قدر دانی کا اظہار فرمایا۔ اسی زمانے میں حضرت چراغ دہلی نے ان سے بیعت کی۔ مگر اس وقت تک ان کی والدہ ماجدہ حیات تھیں۔ اس لیے اجودھیا واپس چلے گئے، کبھی کبھی اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دینے آتے رہتے تھے۔ جب والدہ کا انتقال ہوگیا تو دلی میں آبسے۔ حضرت نظام الدین اولیاء نے 725 ہجری۔ 1325ء کو انتقال فرمایا۔ ان کے لاکھوں مرید تھے اور سینکڑوں حضرات کو خلافت بھی دی تھی، مگر اپنی جانشینی کیلئے حضرت نظام الدین اولیاء نے حضرت چراغ دہلی ہی کا انتخاب کیا۔ ایک دن حضرت چراغ دہلی نے امیر خسرو سے کہا کہ شیخ سے گذارش کرو میرا دل چاہتا ہےکہ اپنے وطن اجودھیا چلا جاؤں اور وہاں جنگل میں بیٹھ کر یکسوئی کے ساتھ عبادت کروں۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا: " ان سے کہو کہ تمھیں دہلی ہی میں رہنا چاہیے اور خلق خدا کی کڑوی کسیلی جھیل کر ان

کے ساتھ اچھا سلوک کرنا چاہیے۔" حضرت چراغ دہلی کے زمانے میں محمد تغلق بادشاہ تھا۔ اس نے بھی آپ کو بہت تکلیفیں پہنچائیں۔ اس زمانے میں ٹھٹھ (سندھ) میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ وہیں آپ کو طلب کیا اور اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس نے آپ کو تین ماہ کیلئے قید خانے میں بھی ڈال دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھٹھ سے محمد بن تغلق کی لاش ہی دہلی آئی۔ حضرت چراغ دہلی نے فیروز شاہ تغلق کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر تخت پر بٹھایا اور دعاء دی جس کا اثر یہ تھا کہ فیروز تغلق نے طویل عرصے تک حکومت کی اور اس کا زمانہ امن خوش حالی، فارغ البالی اور چین سکھ کا زمانہ رہا۔

حضرت نصیرالدین محمود کو چراغ دہلی کیوں کہا جاتا ہے اس بارے میں عوام سے تو بہت سی روایات مشہور ہوگئی ہیں، مگر حقیقت یہ ہیکہ حب حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت مکہ مکرمہ میں تھے اور انھوں نے شیخ حرم عبداللہ یافعی کو اپنے پیر و مرشد حضرت نصیرالدین محمود اودھی کے بارے میں بتایا تو انھوں نے فرمایا تھا کہ وہ تو "اس وقت دہلی میں چراغ محفل کی طرح ہیں"۔ اسی وقت سے علماء اور صوفیہ کے حلقوں میں آپ کا لقب چراغ دہلی رائج ہوگیا۔ آپ صرف ایک بلند مرتبہ درویش ہی نہیں تھے، نہایت عالم و فاضل بھی تھے اور آپ کے ممتاز خلفاء میں بھی بڑے جید علماء کے نام ملتے ہیں۔ حضرت سید محمد حسینی گیسو دراز جن کا روضہ گلبرگہ (کرناٹک) میں ہے، قاضی عبدالمقتدر، مولانا احمد تھانیسری، مخدوم جہانیاں جہاں گشت ان میں چند نمایاں نام ہیں۔ حضرت چراغ دہلی تمام عمر مجرد رہے، شادی نہیں کی، اس لیے آپ کی صلبی اولاد کوئی نہیں۔ آپ کے ملفوظات شیخ حمید قلندر نے "خیرالمجالس" کے نام سے جمع کیے تھے جو فارسی میں ہیں، ان کا اردو ترجمہ بھی مولانا احمد علی سیماب ٹونکی نے کیا تھا جو چھپ چکا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں کثرت عبادت و ریاضت اور قلت غذا کی وجہ سے آپ بہت کمزور ہوگئے تھے۔ اسی زمانے میں تراب نامی ایک قلندر نے آپ کے حجرے میں گھس کر چاقو سے حملہ کیا، اور اتنے زخم لگائے کہ خون حجرے کی نالی سے بہتا ہوا باہر نکل آیا جسے دیکھ کر خدام دوڑے اور اس قلندر کو پکڑ لیا مگر آپ نے سختی سے منع فرمایا کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی جائے، بلکہ اسے کچھ سکے بھی مرحمت فرمائے اور کہا کہ چاقو چلانے سے اس کا ہاتھ دکھ گیا ہوگا کچھ عرصے کے بعد چند روز بیمار رہ کر 18/ رمضان 757ہجری۔ 14/ ستمبر 1356ء کو انتقال فرمایا اور جس حجرے میں آپ رہتے تھے اسی میں مدفون ہوئے۔ آپ کی درگاہ آج بھی جنوبی دہلی میں موجود ہے اور وہ پورا علاقہ چراغ دہلی ہی کہلاتا ہے۔

حضرت چراغ دہلی کے ملفوظات - "خیرالمجالس" پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہیکہ آپ کی پوری زندگی اللہ کی عبادت اور مخلوق خدا کی خدمت و خیر خواہی میں بسر ہوئی۔ آپ کی خانقاہ میں ہر طبقے، ہر پیشے اور ہر مسلک کے لوگ آتے تھے اور آپ کی روحانیت سے فیضان حاصل کرکے اپنے دل کے آئینے کا زنگار دور کرتے تھے۔ آج بھی آپ کی درگاہ میں دلوں کو ڈھارس ملتی ہے اور قلب و روح کو عجب طرح کا اطمینان نصیب ہوتا ہے اور ان زیارت کرنے والوں میں ہندو اور مسلمان اور سکھ سبھی ہوتے ہیں۔

حضرت گیسو دراز رح - حیات اور تعلیمات

حضرت خواجہ سید محمد حسینی گیسودرازؒ قدس سرہ سلسلہ عالیہ چشتیہ نظامیہ کی ایسی بلند پایہ شخصیت ہیں جنھوں نے اس سلسلے کا روحانی فیضان جنوبی ہند کے آخری سرے تک پہنچادیا، آج سرزمین دکن کی سیکڑوں خانقاہیں حضرت گیسودراز ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہیں۔ آپ کے بارہویں دادا سید علی حسینی ہرات سے دہلی تشریف لائے تھے اور یہاں "انار والی مسجد" میں مدفون ہوئے تھے۔ یہ مسجد اب موجود نہیں ہے۔ وہ ۴/ رجب ۷۲۱ھ (۳۰/ جولائی ۱۳۲۱ء) کو پیدا ہوئے اور ایک سو چار سال چار ماہ پندرہ دن اس عالم ناپائدار کو اپنے علمی اور روحانی فیوض، برکات سے مالامال فرماکر دو شنبہ ۱۶/ ذی قعدہ ۸۲۵ھ (۲۱/ اکتوبر ۱۴۲۲ء) کی صبح کو اپنے رفیق اعلیٰ سے واصل ہوئے۔ پہلی بار آپ نے ۱۳۲۶ء (۷۲۷ھ) میں اپنے والدین کے ساتھ اس وقت دولت آباد کا سفر کیا جب محمد بن تغلق نے دارالخلافہ دہلی سے دولت آباد کو منتقل کیا تھا۔ آپ کے والد بزرگوار نے ۵/ شوال ۷۳۱ھ (۱۲/ جولائی ۱۳۳۱) کو دولت آباد ہی میں انتقال فرمایا۔ حضرت گیسودرازؒ کی ابتدائی تعلیم کچھ ان کی نگرانی میں ہوئی اور کچھ اپنے نانا صاحب سے پڑھا، دونوں بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے مرید تھے ان کی زبانی حضرت نظام الدین اولیاؒ اور حضرت چراغ دہلیؒ کے اوصاف اور کمالات سن سن کر بچپن ہی سے اولیاء اللہ کی محبت دل میں بس گئی تھی۔

حضرت گیسودرازؒ صحیح النسب ہیں، ایک بار آپ نے خود فرمایا کہ جنھوں نے فرزندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی رعایت اور ادب اس اعتبار سے نہ کیا کہ وہ سادات ہیں انھیں قیامت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ مثلاً مجھے دیکھو، اب تک کسی نے میری سیادت پر نظر نہیں کی اور اس لحاظ سے میری رعایت نہیں کی کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں عالم ہوں، کوئی سمجھتا ہے کہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا مرید ہوں اور دوسرے فضائل رکھتا ہوں پیر ہوں، مگر سیادت کا احترام کوئی نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ **قل لا اسئلکم**

علیہ اجرا الا المودۃ فی القربیٰ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ و سلم فرماتے ہیں ۔ اکرموا اولادی الصالحون للہ والطالحون لی اور دوسری حدیث شریف ہے من اکرم اولادی فقد اکرمنی ومن اکرمنی فقد اکرم اللہ

اسی طرح آپ فرماتے تھے کہ پیروں کی اولاد کا اکرام کرنے سے بہت فیض ہوتا ہے۔ آپ نے دہلی سے دوبار پاک پٹن کا سفر کیا، دونوں بار شیخ علاء الدین اللہ ہمراہ تھے۔ پہلا سفر گھوڑے پر ہوا تھا، اس بار آپ نے حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکرؒ قدس سرہ کے مزار پر انوار پر حاضری دی اور ایک رات پوری روضہ کے اندر بند رہ کر گزاری، مگر بابا صاحبؒ کی جو اولاد وہاں تھی ان کا احترام، اکرام جتنا چاہیے تھا نہ کیا۔ فرماتے تھے کہ حضرت بابا صاحبؒ نے بھی مجھ پر جتنا لطف، وکرم کرنا چاہیے تھا نہ فرمایا۔ دوسرا سفر دہلی سے پیدل ہوا اور اس بار آپ نے بابا صاحبؒ کی اولاد کا بہت اکرام و احترام کیا تو بابا صاحب کی روحانیت نے بھی لطف و شفقت میں کمی نہ فرمائی حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ :

"انچہ از پایان او حاصل کردم ہنوز برآنم" (جو کچھ نعمت اس وقت مجھے حاصل ہوئی وہ اب تک موجود ہے)

۷۳۶ ھ ۱۳۳۵ ء میں آپ اپنی والدہ ماجدہ اور بڑے بھائی سید حسین عرف چندن کے ہمراہ پھر دہلی تشریف لائے آپ کی ایک بہن بھی تھیں حضرتؒ کی ولادت سے قبل ہی انتقال کر گئی تھیں۔

دہلی میں اس وقت حضرت چراغ دہلیؒ نے ساری فضا کو چشتی انوار سے جگمگا رکھا تھا۔ پہلی بار آپ نے مسجد قوۃ الاسلام میں (جس کا ایک مینار قطب مینار کہلاتا ہے). جمعہ کی نماز میں حضرت چراغ دہلی کو دیکھا تو دل و جان سے فریفتہ ہوگئے۔ ۱۶ / رجب ۷۳۶ ھ یکم مارچ ۱۳۳۶ ء کو ان کے دست مبارک پر بیعت کی اور پھر ایسے سخت مجاہدے کیے کہ حضرت چراغ دہلیؒ نے بھی فرمایا۔ اس نوجوان نے مجھے بھی عالم جوانی کی بھولی ہوئی ریاضتیں یاد دلادیں۔

عبادت و مجاہدات کے ساتھ علوم ظاہری کی تحصیل کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ سید شرف الدین کیتھلی قاضی عبد المقتدر اور مولانا تاج الدین بہادر سے آپ فقہ، تفسیر، حدیث وغیرہ پڑھتے رہے۔ ایک دن اپنے پیر و مرشد سے عرض کیا کہ تھوڑا سا علم تو میں نے حاصل کرلیا ہے اگر اجازت ہو تو اسی پر بس کروں اور شغل باطن میں لگ جاؤں۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے آپ کے علمی کمالات کا بھی پورا اندازہ کرلیا تھا فرمایا کہ ہدایہ، بزدوی، رسالہ شمسیہ، کشافِ مفتاح، صحائف وغیرہ کتابوں کو سبقاً سبقاً پڑھ لو مجھے تم سے بہت سے کام لینے ہیں۔

اب تک چشتی بزرگوں نے تصنیف، تالیف کی طرف توجہ نہیں کی تھی، یہ سلسلہ حضرت گیسو درازؒ ہی سے شروع ہوا اور یہی وہ کام تھا جس کی طرف ان کے شیخ نے اشارہ فرمایا تھا۔

آپ عالم جوانی ہی میں اپنے زہد و اتقا، عبادت و ریاضت اور کمالات علمی و روحانی میں مشہور ہو چکے تھے۔ حضرت چراغ دہلیؒ نے اپنے وصال سے تین دن قبل ۱۵ / رمضان المبارک ۷۵۷ھ ۱۱ / ستمبر ۱۳۵۹ء کو اپنی خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔

حضرت گیسو درازؒ کا مزاج گرم تھا، گرمی کے موسم میں سکنجبین (لیموں کا شربت) پیا کرتے تھے، پسینہ بھی بہت آتا تھا اس لئے لباس عرق چین کا استعمال فرماتے تھے تقریباً ۷۷۱ھ ۱۳۶۹ء میں آپ نے پچاس سال کی عمر میں اطباء کے مشورے سے مولانا جمال الدین مغربی کی پوتی سے نکاح بھی فرمایا جن کے بطن سے دو صاحبزادے سید محمد اکبر حسینی عرف میاں بڑے (ف ۸۱۲ھ) (مولف جوامع الکلم) حضرت سید محمد اصغر حسینی عرف میاں لہرا اور تین صاحبزادیاں تولد ہوئیں۔

جب دہلی پر تیمور لنگ کی فوج کے یلغار کرنے کی خبریں گرم ہوئیں تو آپ نے ۷/ ربیع الثانی ۸۰۱ھ ۱۷ / دسمبر ۱۳۹۸ء کو اپنے اہل و عیال سمیت اس شہر کو خیرباد کہا اس وقت سیر محمدی کے مولف محمد علی سامانی بھی ہم سفر تھے اور انھوں نے اس سفر کی پوری روداد سیر محمدی میں لکھی ہے۔ آپ دہلی کے بھیلسہ دروازے سے نکلے اور بہادر پور (میوات) پہنچے وہاں سے گوالیار، چندیری

ہوتے ہوئے بڑودہ پہنچے وہاں سے کھمبایت تشریف لے گئے ایک بار پھر کھمبایت سے بڑودہ تشریف لائے، اس سفر میں بھی تصنیف، تالیف کا شغل جاری رہا اور ہزاروں بندگان خدا حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔

بڑودہ سے آپ اپنے والد بزرگوار کے مزار پر حاضری دینے کے لئے دولت آباد گئے یہاں کا گورنر حاضر خدمت ہوا اور سلطان فیروز شاہ بہمنی کی جانب سے نذر پیش کی اور درخواست کی کہ آپ گلبرگہ تشریف لے چلیں جو بہمنی حکومت کا دارالسلطنت تھا۔ بادشاہ نے اپنے تمام امراء اور خدم و حشم کے ساتھ شہر سے باہر نکل کر استقبال کیا اور گزارش کی کہ آپ اسی شہر کو اپنے مستقر ہونے کا شرف عطا فرمائیں جسے حضرتؒ نے منظور فرمالیا اور نواح گلبرگہ کے موضع چنچولی میں اترے شہر گلبرگہ کے اکابر اشراف، پیشہ ور، غرباء، مساکین ہزاروں کی تعداد میں آپ کی قدمبوسی کے لئے آنے لگے بڑے امراء اور اکابر تو آکر حضرت کے قدموں پر گر جاتے تھے مگر پیشہ ور غریبوں کو اس کا موقع نہ ملتا تھا وہ جوق در جوق صحرا میں کھڑے رہتے تھے اس امید پر کہ حضرت کی پالکی ادھر سے گزرے گی تو ہم پابوسی کریں گے۔

دکن میں حضرت کا روحانی فیضان گوشے گوشے میں پھیل گیا۔ یہ حضرت ہی کی توجہ تھی کہ سلطان احمد شاہ نے شریعت کے قوانین کو نافذ کیا اور آج تک احمد شاہ ولی کے نام سے مشہور ہے۔

آپ کی تصانیف کی تعداد ۱۰۵ بتائی جاتی ہے ان میں تفسیر ملتقط بھی ہے، حدیث میں مشار الانوار کی شرح ہے تصوف میں عوارف المعارف فصوص الحکم اور قشیریہ کی شرحیں ہیں دیوان فارسی ہے، مکتوبات میں سیرۃ النبی پر ایک کتاب ہے دوسری فقہ اکبر کی شرح ہے غرض ایک طویل فہرست ہے۔ یہ کتابیں اکثر فارسی میں اور بعض عربی میں ہیں۔ ان کے علاوہ آپ کا ہندوی کلام بھی ہے خانقاہ میں عوام سے ہندوی ہی میں گفتگو فرماتے تھے۔

طالبین کی روحانی تربیت اور ارشاد و ہدایت کے ساتھ درس و تدریس کا سلسلہ آخر زمانے تک جاری رہا۔

ملفوظات : آپ کے ملفوظات کے کئی مجموعے ترتیب دئے گئے ایک مجموعہ ملفوظات سید ابن الرسول عرف میاں منجھلے نے دہلی میں مرتب کرنا شروع کیا تھا اور گلبرگہ میں اس کی تکمیل ہوئی یہ اب نہیں ملتا۔

دوسرا مجموعہ ملفوظات قاضی علم الدین اجودھنی نے ۸۱۱ ھ میں مرتب کیا تھا۔ تیسرا مجموعہ شیخ الاسلام چھترہ نے اور چوتھا منظوم مجموعہ ملک زادہ عثمان جعفر نے تیار کیا لیکن اس وقت صرف جوامع الکلم ہمارے پاس ہے جو حضرت سید محمد اکبر حسینی (ف ۸۱۲ ھ) نے فراہم کئے تھے۔ اور یہ بیش بہا معلومات کا خزانہ ہے اس کا اردو ترجمہ بھی روضہ بزرگ کی جانب سے شائع ہوچکا ہے مگر فارسی متن میں غلطیاں بہت ہیں اور ضرورت ہے کہ اس کا اچھا ایڈٹ کیا ہوا ایڈیشن چھاپا جائے۔

خانقاہ : حضرت کی خانقاہ کے رہنے والوں میں ایک دوسرے کا محتسب تھا، ایک سے کوئی لغزش ہوتی تھی تو دوسرا اسے ٹوک دیتا تھا اور کہتا تھا کیا تصوف میں ایسا ہوتا ہے؟ مشائخ کے عمل سے کیا یہ ثابت ہے جو تم کر رہے ہو، وہ شخص فورا باز رہتا اور معذرت کرتا تھا۔ اگر کوئی نیا آدمی خانقاہ میں آتا تھا جسے طریق مشائخ کا علم نہ ہوتا تھا یا وہ یاران خانقاہ کی بات نہ سنتا تھا تو اسے حضرتؒ کی زبان سے نصیحت کرادی جاتی تھی۔ کوئی کسی کی رعایت نہ کرتا تھا الحب للہ والبغض للہ والا معاملہ تھا۔

حضرت کو اپنے یاران خانقاہ کا اس درجہ خیال تھا کہ اگر آپؒ کا کوئی پوتا یا نواسا بھی ان سے سخت کلامی کرتا تھا تو آپ غصہ ہوجاتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ اتنے فقرا اپنی محبت سے میرے چاروں طرف جمع ہوگئے ہیں انھیں کیوں پریشان کرتے ہو، آپ کے خوف سے سب ان فقراء کا لحاظ کرتے تھے ایک دن آپ کے داماد میاں سالار اور مولانا نور الدین کے درمیان کچھ ترش گفتگو ہوگئی۔ مولانا نور الدین خانقاہ سے نکل کر میاں بڑے کے روضے میں جا بیٹھے۔ یہ بات شیخ کو معلوم ہوئی تو سید سالار پر بہت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ خانقاہ کے لائق وہ ہے تم جیسے نہیں جاؤ انھیں ابھی منا کر لاؤ۔ سید سالار نے کسی کو واسطہ بنا کر مولانا نور الدین سے صلح کی اور انھیں

خانقاہ میں لے کر آئے۔

اولاد: حضرت اپنے اور اپنے فرزندوں کے فقر کا حال سب کے سامنے فخر سے بیان فرماتے تھے اور کہتے تھے میں نے میاں بڑہ اور میاں لہرہ کی پرورش فقر میں کی ہے امارت میں نہیں۔
قاضی فخرالدین میا بڑہ کی خدمت میں برسوں رہے انھوں نے کہا کہ میں نے کبھی میاں بڑے کی زبان سے دنیا کی کوئی حکایت نہیں سنی یا حقائق و معارف کی بات کرتے تھے یا علوم ظاہری کی۔
اسی طرح میاں لہرہ نے کبھی اپنی والدہ ماجدہ سے بھی کسی کھانے کی فرمائش نہیں کی یہ پکاؤ یہ نہ پکاؤ جو کچھ وہ بھیج دیتی تھیں وہ کھالیتے تھے رات کو اکثر میاں لہرہ جنگل اور صحرا کی طرف نکل جاتے تھے کبھی گھر آتے تو بالاخانے پر رہتے تھے گھر میں چار پائی بستر سب ہوتا تھا مگر آپ چار پائی کھڑی کردیتے اور زمین پر لیٹ جاتے تھے اگر غسل کی ضرورت ہوتی تو دو تین دن کے رکھے ہوئے ٹھنڈے پانی سے غسل کرلیتے تھے حضرت گیسودرازؒ کا حلیہ مبارک جو ان کے پوتے حضرت ابولفیض من اللہ حسینی قدس سرہ نے بیان کیا تھا یوں ہے:

حضرت خواجہ گیسو درازؒ کی وضع ترکوں جیسی تھی ہڈیاں چوڑی اور بڑی تھیں جسم دراز اور استوار تھا انتقال سے سات یا دس سال پہلے پیروں سے معذور ہوگئے تھے کھڑے نہیں ہو سکتے تھے، مسجد میں یا اپنے گھر میں یا کسی فرزند کے گھر میں جانا ہوتا تھا تو کرسی پر تشریف رکھتے تھے اور خدام اسے اٹھا کر لے جاتے تھے حضرت ابوالفیض نے فرمایا کہ میں نے دادا صاحبؒ کو بیٹھا ہوا ہی دیکھا ہے کھڑے ہوتے دیکھنا یاد نہیں۔

۱۶ / ذقعدہ ۸۲۵ھ یکم نومبر ۱۴۲۲ء کو عشا کے بعد آپ پر بھی دوسرے صوفیائے چشت کی طرح استغراق کا غلبہ ہوگیا تھا۔ عشا کی نماز اشاروں سے پڑھی تھوڑی دیر کے بعد خدام سے پوچھا کہ میں نے نماز پڑھ لی ہے؟ انھوں نے عرض کیا جی ہاں۔ مگر آپ نے دوبارہ نماز ادا کی۔ تہجد کے وقت اتنا ہوش نہ رہا کہ نماز تہجد پڑھ سکیں مگر حاضرین نے کان لگا کر سنا تو آپ یہ آیت پڑھ رہے تھے:

ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین

لوگ یہ سن کر زار زار رونے لگے اور کہنے لگے کہ حضرت نے سالہا سال تہجد کی نماز میں یہ آیت پڑھی ہے اس وقت بھی وہی تلاوت فرما رہے ہیں۔

انتقال سے ایک یا دو دن قبل آپ نے وصیت فرمائی تھی کہ دفن کے وقت حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی کا مکتوب مبارک میرے داہنے ہاتھ میں رکھ دیں۔ یہ وہ خط تھا جو حضرت چراغ دہلیؒ نے اس وقت لکھا تھا جب آپ اپنی بہن سے ملنے کے لئے بیانہ گئے ہوئے تھے اس خط میں اشتیاق ملاقات کا اظہار تھا اور حضرت گیسودرازؒ کو بلایا تھا۔ اور فرمایا کہ میرے دوسرے ہاتھ میں حضرت چراغ دہلی کی تسبیح رکھ دیں۔ اور مرید کرتے وقت جو کلاہ انھوں نے مرحمت فرمائی تھی وہ میرے سر پر رکھ دیں اس طرح مجھے دفن کریں۔ چنانچہ وصیت کی تعمیل کی گئی۔

میاں یمین الرحمن نے حضرت کے وصال کی خبر میاں لہرہ کو پہنچائی کہ بندگی مخدوم کا انتقال ہوگیا تو انھوں نے کمال استقامت سے فرمایا وہ واصل بخدا تھے اور جسے وصال حق نصیب ہوگیا ہو وہ زندۂ ابد ہوجاتا ہے اور ذات حق کے ساتھ ابد تک باقی رہتا ہے۔ یہ انتقال صوری ہے انتقال معنوی نہیں ہے ان اولیاء اللہ لا یموتون بل ینتقلون من وراء الی دار۔ جب حضرت گیسودرازؒ کو غسل دیا گیا تو میاں لہرہ آئے اور غسل کا پانی لے کر اس سے وضو کیا اسی طرح قاضی راجا نے بھی آب غسل سے وضو کیا اور حضرت کے جنازے کی نماز ادا کی۔ تدفین کے بعد میاں لہرہ عوارف المعارف کے درس میں مشغول ہو گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ گیسودرازؒ کے فضائل و کمالات کا اندازہ ہم جیسے بے علم و سیاہ نامہ تو کیا کرسکتے ہیں اہل نظر بھی ان کی رفعتوں کو پوری طرح نہیں پاسکتے۔ ایک بار خود حضرت گیسودرازؒ نے فرمایا:

افسوس کہ میں اس سخت ابتلا اور مشکلوں کے زمانے میں پیدا ہوا (اگر عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں یا عہد صحابہ و تابعین میں یا زمانہ تبع تابعین میں یا جنید و شبلی کے دور میں پیدا ہوا ہوتا تو میرا کام ان کے کام سے کم نہ ہوتا) حضرت کے خاص مرید خواجہ

احمد دبیر نے کہا کہ مخدوم اگر اس زمانے میں نہ ہوتے تو خلق اللہ کی رہنمائی کون کرتا؟ اور ہمیں یہ ارشاد و ہدایت کس سے ملتی؟

حضرت نے فرمایا: "تم لوگ تو میرے معتقد ہو اپنے اعتقاد و ارادت کی بنا پر ایسی باتیں کہتے ہوں مگر یہ تو میں ہی جانتا ہو کہ مجھ پر کیا بلائیں گذرتی ہیں اور کیسے کرب سے دوچار رہتا ہوں"۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادیؒ

دلی میں جامع مسجد کے مشرقی دروازے اور لال قلعے کے درمیان 1857ء سے پہلے بہت پررونق اور گنجان آباد علاقہ تھا جسے 1857ء کے بعد انگریزوں نے بالکل مسمار کردیا اس لیے کہ یہاں لیسے ہوشیار اور ماہر فن کرخندار تھے جو ولایتی بندوقوں کے مقابلہ کے ہتھیار بناسکتے تھے۔ اصل میں انتقامی جذبے کے تحت انھیں بے گھر کرنا مقصود تھا۔ یہ سارا علاقہ مرزا غالب کی آنکھوں کے سامنے ڈھایا گیا وہ پالکی میں بیٹھ کر یہ دلدوز منظر دیکھنے جاتے تھے اور پھر اپنے دوستوں کو خطوں میں اس کی تفصیل لکھتے تھے۔ اسی علاقہ میں خانم بازار تھا جو شمالا جنوبا پھیلا ہوا تھا یہاں ایک حویلی میں سلسلہ چشتیہ نظامیہ کی وہ عظیم ہستی رہتی تھی جسے آج "حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آباد" کہا جاتا ہے۔ جہاں آج حضرت کا مزار مبارک ہے یہی آپ کی حویلی تھی اور آپ اپنی حویلی کے صحن ہی میں دفن کیے گئے تھے۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی کے اسلاف اور خاندان کا پیشہ معماری تھا اور یہ لوگ اس فن میں اپنے زمانے کے ماہرین مانے جاتے تھے۔ ان کے مورث اعلیٰ کو لال قلعے کی تعمیر کیلئے شاہ جہاں نے خجند سے دہلی بلایا تھا۔ دلی کی جامع مسجد بھی حضرت شاہ کلیم اللہ جہاں آبادی کے اجداد کی بنائی ہوئی ہے۔ لطف اللہ مہندس جن کا فارسی دیوان بھی شائع ہوچکا ہے، حضرت شیخ کے تایا تھے۔ یہ وہی لطف اللہ مہندس ہیں جن کے والد شیخ احمد معمار نے آگرے کا تاج محل تعمیر کیا تھا۔ انھیں شیخ احمد معمار کے بیٹے شیخ نور اللہ، ہمارے حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے والد بزرگوار ہیں۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کے خوش نویس بھی تھے۔ جامع مسجد دلی کے دروں پر کتبے اور قرآنی آیات انہی شیخ نور اللہ احمد کے فن خطاطی کا نمونہ ہیں۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کی ولادت 24/ جمادی الثانیہ 1060 ہجری (23 / جون 1650ء) کو ہوئی ان کی تعلیم و تربیت جن باکمال اساتذہ کی نگرانی میں ہوئی ان میں حضرت ابوالرضا فاروقی کا نام بھی آتا ہے جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے تایا ہیں رسمی تعلیم سے فارغ ہوئے تو دل کی شورش اور ذوق طلب نے مدینہ منورہ میں حضرت شیخ یحییٰ مہاجر مدنی کی خدمت میں پہنچا دیا جو حضرت شیخ کمال الدین علامہ (خواہرزادہ حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی) کی اولاد میں سے تھے۔

حضرت شیخ یحیی مدنی سے خلافت و اجازت لے کر دہلی آئے تو خانم بازار میں اپنی خانقاہ میں رہنے لگے ۔ ان کی ہدایت سے سلف کی سنت پر قائم رہ کر توکل اور قناعت کی زندگی گزاری۔ نہ کبھی بادشاہ وقت سے ملنے گئے نہ دربار کی طرف سے کوئی نذرانہ یا جاگیر قبول کی۔ آپ نے اپنی بڑی حویلی کو ڈھائی روپیہ ماہوار کرائے پر اٹھا دیا تھا خود آٹھ آنے ماہوار کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور دو روپیہ میں گھر اور خانقاہ کے نو دس افراد کا گزارا ہوتا تھا۔ کبھی کچھ آمدنی فتوح اور نذرانے سے بھی ہوجاتی تھی۔

حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی نے 24/ ربیع الاول 1142 ہجری مطابق 17/ اکتوبر 1729ء کو انتقال فرمایا۔ اور اپنی حویلی میں دفن کیے گئے۔

ان کے ممتاز خلفاء میں حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی ہیں جن کے فرزند حضرت شیخ فخرالدین محب النبی دہلویؒ بھی سلسلہ نظامیہ کے مجددین میں سے ہیں۔ حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی ان ہی کے خلیفہ مجاز تھے۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی صاحب تصانیف تھے ۔ ان کی تقریبا دس تصانیف ہمیں معلوم ہیں ، شائع بھی ہوچکی ہیں۔

حضرت کے خلفاء کی بڑی تعداد تھی جو ہندوستان کے مختلف گوشوں میں سلسلے کی ترویج کا سبب بنے ۔ لیکن سب سے ممتاز شخصیت حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کی ہے جن کا مقبرہ آج بھی اورنگ آباد میں موجود ہے ۔ پہلے یہیں آپ کی حویلی تھی جس کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں۔

حضرت شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے مقبرے سے پہلے داہنے ہاتھ کو ایک احاطے میں ایک بوسیدہ سی قبر ہے ۔ اس میں حضرت نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے مرید و خلیفہ نواب کامگار خاں حسینی آرام کررہے ہیں۔ یہ سب زمین انھوں نے اپنے پیر و مرشد کو نذر کی تھی جس پر آپ کی خانقاہ ، مسجد ، حویلی اور مقبرہ بنا ہوا ہے اور انھوں نے ہی آپ کے ملفوظات " احسن الشمائل " ترتیب دیئے تھے ۔ اس مجموعے کے علاوہ ایک اور مجموعہ ملفوظات بھی انھوں نے مرتب کیا جس کا قلمی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں محفوظ ہے ۔ انھوں نے ان ملفوظات کے متعدد قلمی نسخے نہایت اہتمام سے اور بہت خوش خط تیار کرائے تھے ۔

خواجہ محمد کامگار حسینی اور خواجہ نور الدین حسینی دونوں حقیقی بھائی تھے ۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت سیدنا حسین ابن علی رضی اللہ عنہما سے ملتا ہے اور آبائی وطن حصار (ہریانہ) تھا مگر آخر عہد اورنگ زیب میں شاہی لشکر کے ساتھ دکن گئے تھے اور وہیں رہنے لگے تھے۔

خواجہ کامگار نے حضرت شیخ کلیم اللہ جہان آبادی کی بیس مجلسوں کا حال مجالس کلیمی کے نام سے قلمبند کیا تھا۔ یہ مجموعہ بہت کمیاب ہے اس کا ایک نہایت خوش خط جلی نسخہ کتب خانہ سالار جنگ حیدرآباد میں موجود ہے۔ یہاں اسی کا تعارف قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

خواجہ کامگار حسینی اور خواجہ نور الدین اپنے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کی خدمت میں شب و روز کے حاضر باش تھے ۔ حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی ان کے دادا پیر صدر حیات میں تھے اور دہلی میں رشد و ہدایت کا چراغ ان کی خانقاہ میں روشن تھا۔ دونوں بھائیوں کو بڑی تمنا تھی کہ داد پیر کی قدم بوسی کریں۔ یہ فرخ سیر کا زمانہ تھا۔ اس کی طرف سے بخشی الممالک امیر الامراء حسین علی خاں دکن میں گورنر تھا جو بعد کو " بادشاہ گر " مشہور ہوا۔ فرخ سیر نے سیاسی مصلحت سے نواب حسین علی خاں کو مرکز میں طلب کیا تو وہ ایک لمبا چوڑا قافلہ لے کر دہلی کی طرف روانہ ہونے لگے ۔اس وقت خواجہ نور الدین نے چاہا کہ وہ بھی اس قافلے میں شامل ہوجائیں۔ لیکن حضرت پیرو مرشد نے انھیں اجازت نہیں دی البتہ ان کے بھائی خواجہ کامگار حسینی کو سفر کا ایماء ہوا۔ وہ 3/ محرم 1132ہجری (25/ نومبر 1718ء) کو اورنگ آباد سے نکلے اور دہلی میں اپنے داد پیر حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کی خدمت میں پہنچ گئے ۔ اسی سال 27/ ربیع الاول (16/ فبروری 1719ء) کو اورنگ آباد میں ان کے بھائی خواجہ نور الدین حسینی کا انتقال ہوگیا جس کی سناونی انھیں دہلی میں ملی اور اب سمجھ میں آیا کہ شیخ نے انھیں دہلی کے سفر کی اجازت کیوں نہیں دی تھی۔ انھوں نے سوچا کہ مرحوم بھائی کی روح کو خوش کرنے کیلئے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہوسکتا کہ حضرت شیخ کلیم اللہ کی زبان گوہر افشاں سے جو کچھ سنا جائے اسے قلم بند کرلیا جائے اور اس طرح یہ مختصر سی تالیف اس مرحوم کی یادگار بن جائے۔

مجالس کلیمی میں پہلی مجلس 28/ ربیع الاول 1132ہجری (18/ فبروری 1719ء) اتوار کی ہے۔ آخری اور چودھویں مجلس 20/ جمادی الاولیٰ (7/ اپریل 1719ء) جمعرات کو قلم بند ہوئی ہے۔ اس

کامطلب یہ ہے کہ مجالس کلیمی کی 14 مجلسوں کا زمانہ تقریبا ایک ماہ 20 روز پر پھیلا ہوا ہے۔

پہلے دن یہ حاضر ہوئے تو حضرت شیخ کلیم اللہ نے سب کی خیروعافیت پوچھی۔ ان کے بھائی خواجہ نور الدین اور اپنے چہیتے مرید حضرت شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کا حال اور کیفیت مزاج دریافت کی اور خواجہ کامگار کے آنے پر اپنی خوشی کا اظہار فرمایا۔

دوسری مجلس میں 4/ ربیع الثانی 1132 ہجری (24/ فبروری 1719ء) کو جمعہ کے دن یہ تذکرہ ہوا کہ فرخ سیر بادشاہ ہندوستان ملکی امور سے بے خبر رہتا ہے اور کاروبار حکومت ٹھپ پڑا ہوا ہے۔ بادشاہ کیلئے اتنی بے خبری مناسب نہیں۔ اس موقع پر آپ نے فرخ سیر کے دادا اورنگ زیب عالمگیر کا ایک قصہ سنایا اور فرمایا کہ وہ خبرداری و ہوشیاری میں بے نظیر تھا۔ ہمارے شیخ یحیی مدنی اپنی والدہ ماجدہ کی اجازت سے زیارت حرمین کیلئے تشریف لے گئے تھے ان کی والدہ گجرات میں تھیں۔ ان سے وعدہ کرگئے تھے کہ حج و زیارت کے بعد واپس آجاؤں گا لیکن مدینے کی سرزمین ایسی دامن گیر تھی کہ آنے کو جی نہ چاہتا تھا اور رہ رہ کر والدہ سے کیا ہوا وعدہ بھی یاد آتا تھا۔ ایک دن روضہ نبوی اعلیٰ صاحبہا الصلوۃ و السلام پر ایک درویش عثمان حاضر ہوئے یہ نہایت خوش وضع، خوش رو اور ذی وجاہت تھے۔ سیاہ جبہ پہنے سیاہ عمامہ باندھے ان کے تمام ساتھی بھی ایک سے لباس میں صف باندھے کھڑے تھے۔ شیخ یحیی مدنی ان بزرگوں کی صورت پر گرویدہ ہوگئے اور دل میں سوچا کہ مجھے ان سے مشورہ کرنا چاہیے کہ یہاں رہوں یا والدہ کی خدمت میں واپس جاؤں۔ شیخ عثمان نے کہا کہ والدہ سے وعدہ خلافی نہیں کرنی چاہیے۔ لہذا یہ واپس آگئے کچھ عرصہ کے بعد والدہ ماجدہ کا انتقال ہوگیا تو اب اہل عیال کے بندھن ہجرت نہ کرنے دیتے تھے مگر ان کا دل وہیں مدینہ منورہ میں اٹکا ہوا تھا۔ ایک بار مدینہ منورہ سے کچھ دوستوں نے ایک حاجی کے ہمراہ آب زمزم کا ہدیہ بھیجا۔ شیخ نے اسے احتیاط سے رکھا اور فرمایا کہ جس دن فقراء و صلحاء کا مجمع ہوگا اسے تقسیم کریں گے۔ 27/ رجب کی شب میں بہت سے مرد، عورت، عقیدت مند اور فقراء و صلحاء جمع ہوئے آپ نے عشاء کی نماز کے بعد وہ آب زمزم طلب کیا اور سب کو تقسیم کرکے فرمایا کہ اس کا خاصہ یہ بتاتے ہیں کہ جس نیت سے پیئے اور دعا مانگے وہ قبول ہوتی ہے۔ آپ نے مدینہ منورہ میں جاکر لینے کی نیت کی اور آب زمزم نوش کرکے دعاء مانگی۔ کچھ ایسا نشانے پر تیر لگا کہ اسی رات کو مکمل بے سروسامانی کے عالم میں پیادہ پا سفر حجاز کیلئے نکل کھڑے ہوئے۔

صبح کو کچھ دیر تک زنان خانے کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ آپ مردانے مکان میں ہیں اور ادھر یہ خیال رہا کہ زنان خانے میں تشریف رکھتے ہیں۔ جب ذرا دن چڑھنے لگا تو معلوم ہوا کہ آپ تشریف لے جاچکے ہیں۔ تلاش شروع ہوئی۔ ایک گھسیارے نے بتایا کہ میں فلاں جنگل میں انھیں نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ غرض لوگ تلاش کرتے ہوئے پہونچ گئے دیکھا کہ جنگل میں چاشت کی نماز پڑھ رہے ہیں۔ عصا ایک طرف پڑا ہوا ہے۔ خدام نے بہت گڑگڑا کر التجا کی کہ آپ واپس تشریف لے چلیں مگر آپ نے فرمایا کہ اب ہم نے مدینہ منورہ ہی میں جاکر رہنے کا ارادہ کرلیا ہے۔ جب خدام نے دیکھا کہ آپ ہرگز ارادہ منسوخ نہ کریں گے تو آپ سے وصیت اور ہدایات طلب کیں اور پوچھا کہ صاحبزادوں میں سے کسے آپ کا سجادہ نشین بنایا جائے ؟ شیخ یحیی مدنی نے فرمایا کہ بڑے بیٹے تو جنون کی کیفیت میں ہیں اور مسند ارشاد پر سالک مجذوب ہونا چاہیے۔ دوسرے بیٹے اس ذمہ داری کے اہل نہیں ہیں انھیں سرکاری ملازمت قبول کرلینی چاہیے۔ یہ فرماکر چلے گئے۔ مدینہ طیبہ میں شب برات کو تہجد کی نماز کیلئے اٹھے تو پانوں پھسل گیا جس سے ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس طرح آپ مدینہ منورہ سے کہیں سفر کرنے کی ظاہری صورت سے بھی بے نیاز ہوگئے۔ پھر آخر حیات تک وہاں اپنے مکان ہی میں مقیم رہے۔

جن صاحبزادے کو آپ نے سرکاری ملازمت کرنے کی وصیت کی تھی وہ گجرات سے دہلی آئے اور صدر الصدور موسی خان سے ملے انھیں بتایا کہ والد نے ہجرت کرتے وقت مجھے ملازمت کرنے کی وصیت کی ہے۔ صدر الصدور نے بادشاہ عالمگیر کی خدمت میں جاکر عرض کیا کہ گجرات سے شیخ محمد یحیی مدنی کے صاحبزادے نوکری کی طلب میں آئے ہیں۔

عالمگیر نے انھیں رات کے وقت خلوت میں طلب کیا تاکہ اطمینان سے کچھ دیر بات کرسکے۔ ملاقات ہونے پر صاحبزادے سے بادشاہ نے پوچھا کہ آپ کے دہلی آنے کا کیا باعث ہوا ؟ انھوں نے عرض کیا کہ میرے والد شیخ یحیی نے مجھے نوکری کرنے کا حکم دیا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا کہ شیخ کس تاریخ کو مدینہ منورہ کیلئے روانہ ہوئے تھے ؟ صاحبزادے نے کہا کہ 26/ رجب کو۔ عالمگیر نے کہا۔ مگر گجرات کے واقعہ نگار نے ہمیں جو رپورٹ بھیجی تھی اس میں تاریخ 27/ رجب لکھی تھی۔ صاحبزادے نے عرض کیا کہ وہ 26/ تاریخ تھی اور 27/ کی شب تھی واقعہ نگار نے شب کے حساب سے 27/ لکھ دی ہوگی۔

یہ واقعہ سنانے سے حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کا مقصود یہ تھا کہ عالمگیر کا حافظہ اور

یادداشت اور امور مملکت کی معمولی سی باتوں سے بھی باخبری کا یہ عالم تھا اور اب اس کے پوتوں کو بڑی بڑی مہموں کا بھی ہوش نہیں ہے۔

ابھی کامگار خاں حضرت شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کی خانقاہ میں ہی مقیم تھے کہ فرخ سیر کا قتل ہوا۔ (8/ جمادی الثانی 1130 ہجری۔ بقول تاریخ محمدی اور 1131، بقول سرکار) اور رفیع الدرجات کو تخت نشین کیا گیا۔ 6/ ربیع الثانی 1132 ہجری کی مجلس میں حضرت شیخ انقلاب زمانہ اور فنائے عالم کے موضوع پر گفتگو فرماتے رہے اور فرمایا عالم میں سلسلہ فناء و بقاء ہر وقت جاری ہے۔ مثلاً کوئی بہتی ہوئی نہر کو دیکھے تو اس میں پانی نظر آئے گا مگر حقیقت پر غور کرے تو جو پانی پہلی نظر میں دیکھا تھا وہ جاچکا ہوگا اور دوسرا اس کی جگہ آگیا ہوگا۔ اسی طرح چراغ کی لو دیکھنے میں روشن ہے مگر پہلی بار جو لو چلی تھی وہ عالم فنا میں چلی گئی اور دوسری لو اس کی جگہ آگئی۔ اس طرح فناء و بقاء کا عمل باہم متصل اور متواتر رہتا ہے۔

مغل سیلست کے انتشار کا اس سے یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ 9/ ربیع الثانی کو رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ اگلے دن شیخ کی مجلس میں اس کا تذکرہ ہوا تو یہ بات زیر بحث تھی کہ نئے بادشاہ کا نام رفیع الدولہ ہے یا رفیع الدرجات۔ کامگار خاں نے کہا کہ ہم نے رفیع الدولہ سنا ہے۔ کسی شخص نے کہا کہ بادشاہ حال کے سکہ میں یہ کہا گیا ہے۔

زد سکہ بہ ہند با ہزاراں برکات　　　　شاہنشہ بحر و بر رفیع الدرجات

آپ نے فرمایا تم نے دلیل کے ساتھ بات کہی۔

11/ ربیع الثانی (2/ مارچ 1719ء) کو جمعہ تھا۔ خواجہ کامگار حسینی جامع ملفوظات نے جامع مسجد دہلی میں نماز جمعہ ادا کی۔ بادشاہ رفیع الدرجات بھی آیا اور اس کا پہلا خطبہ پڑھا گیا۔ نواب قطب الملک امیر الامراء جو سادات بارہہ کے بادشاہ گر برادران میں سے تھا اور دوسرے امراء کی فوج ساتھ تھی۔ سب نے تخت نشینی کی مبارکباد پیش کی۔ امام مسجد کو خلعت عطا ہوا۔ اس زمانہ میں مرہٹوں کی فوجیں وزیرآباد میں پڑی تھیں، ان کے سپاہی شہر میں گشت کرتے تھے اور ان کا شہریوں سے کسی نہ کسی بات پر بلوہ ہوجاتا تھا۔ قلعہ سازشوں کا گڑھ بنا ہوا تھا۔ عوام کی نظریں صرف اللہ تعالی کی قدرت و رحمت کے ظہور پر رہتی تھیں۔

ان ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ کلیم اللہ دہلوی کو نقرس کا آزار بہت دنوں سے تھا اس کی وجہ سے اکثر جلاب لیا کرتے تھے اور سوئے کا ساگ رسر کے میں پیس کر اس کا لیپ کرتے تھے۔

ساتویں مجلس میں ضمناً یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کے ہاتھ کا لکھا ہوا فصوص الحکم کا ایک نسخہ بادشاہ فرخ سیر کے کتاب خانہ میں موجود تھا۔ وہ بادشاہ نے کسی نااہل کو بخشش کردیا تھا۔ بر سبیل گفتگو ارشاد فرمایا کہ کتاب مصنف کی بہترین یادگار ہوتی ہے۔ اگر ایک کتاب بھی قلم سے ڈھنگ کی نکل جائے تو مصنف کا نام باقی رہتا ہے۔ یہی حال اولاد کا ہے اور اسی پر مرید کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ اگر کسی شیخ کو ایک مرید بھی اچھا ہاتھ آجائے تو سلسلے کی رونق بڑھا دیتا ہے اور ہر شہر و دیار میں اس کا نام روشن کردیتا ہے جیسے ساری غزل میں کوئی پُرمضمون شعر وارد ہوجائے جسے بیت الغزل کہتے ہیں۔

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلوی اپنی خانقاہ میں طالبوں کو تفسیر مدارک اور بیضاوی کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ جس میں بعض منتہی علماء بھی شریک ہو کر استفادہ کرتے تھے۔ شام کو مغرب کی نماز خانقاہ میں پڑھ کر اندرون مکان تشریف لاتے تھے کبھی جمعرات کے دن حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کی مزار پُرانوار کی زیارت کے لیے جاتے تھے۔ شب میں وہاں قیام کرتے اور اگلے دن جمعہ کی نماز دہلی میں آکر ادا فرماتے تھے۔

ان ملفوظات میں شریعت و طریقت کے نکات بھی بیان ہوئے ہیں لیکن ہم نے اس مجموعے کے اہم اور کم یاب ہونے کے پیش نظر اس کا اجمالی اور عمومی تعارف کرانا زیادہ مناسب سمجھا۔ ایک مجلس میں فرمایا کہ اسلام کے ارکان کی اصل صبر ہے۔ مثلاً نماز میں بات چیت نہ کرنے اور ادھر ادھر نہ دیکھنے پر صبر، روزے میں کھانے پینے سے باز رہنے پر صبر، حج میں صعوبت سفر اور ترک لباس وغیرہ پر صبر، زکواۃ میں اپنے مال کو خود سے جدا کرنے پر صبر۔ گویا تمام احکام اسلام کی تعمیل صبر پر بنی ہے اور اسی کا اجر طرح طرح سے ملے گا۔ 7/ جمادی الاولیٰ 1132 ہجری کو بدھ کے دن۔ ایک شخص آیا اور کہا کہ فلاں امیر کو اس فقیر کیلئے دو کلمے سفارش کے تحریر فرما دیں۔ آپ نے قلمدان طلب کیا اور رقعہ لکھ کر اسے دے دیا۔ پھر خواجہ کامگار خاں کو بتایا کہ یہ صاحب جنھیں سفارشی خط لکھ کر دیا ہے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پوتوں میں سے ہیں۔ جو مشہور عالم اور درویش تھے جن کی تالیف

اخبار الاخیار ہے۔ کامگار خاں نے کہا شیخ محدث دہلوی کی تو بہت سی تصانیف رائج ہیں افسوس ہے کہ ایسی بزرگ شخصیت کا پوتا افلاس و تنگدستی اور احتیاج میں گرفتار ہو۔ اس زمانے میں کوئی بزرگ زادوں کا قدرداں نہیں ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ بزرگ زادوں کی قدر پہچانتا اور ان کے ساتھ مراعات کرنا تمام خلائق پر واجب و لازم ہے۔ بزرگ زادے خواہ اپنے اعمال میں کیسے بھی ہوں ان کا احترام کرنا چاہیے اور ان کے بزرگوں پر نظر رکھنی چاہیے۔

20/ جمادی الاولی 1132 ہجری (29/ مارچ 1720ء) جمعرات کے دن حضرت شیخ نے اپنے چہیتے مرید و خلیفہ شیخ نظام الدین اورنگ آبادی کے نام ایک خط لکھ کر دیا اور نواب کامگار خاں کو اورنگ آباد کیلئے رخصت کردیا۔ اس طرح اہل راز و نیاز کی یہ ظاہری صحبت اختتام کو پہنچی جس کا حال مجالس کلیمی کی چودہ مجلسوں کے ضمن میں بیان ہوا ہے۔

خانقاہی نظام

پریم کا درس ایک صوفی دے سکتا ہے، ایک بھگت دے سکتا ہے اور دلوں کو ملانے کا کام ایک خانقاہ ہی کر سکتی ہے۔

تصوف روحانی تجربہ کا نام ہے۔ یہ تجربہ ہر مذہب میں ہوتا ہے۔ اصطلاحیں بدل جاتی ہیں لیکن صوفیا کی عوام دوستی اور خدمتِ خلق نے تصوف کو صرف ایک انفرادی روحانی تجربہ نہیں رہنے دیا۔ محبت اور رواداری کی ایک تحریک بنادیا۔ یہی سبب ہے کہ آج صوفیوں کے مزارات، خانقاہیں اور درگاہیں ہر گوشے میں موجود ہیں اور لوگ عقیدت کے پھول چڑھاتے ہیں۔ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری غریب نوازؒ چشتی سلسلہ کے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے اجمیر میں پڑاؤ ڈالا۔ آپ کی وہاں آمد کے بارے میں افسانوی رنگ کی بہت سی باتیں مشہور کردی گئی ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ایک بے سروساماں درویش کا کسی اجنبی شہر میں آکر بس جانا، خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ درویش کا مسلک محبت، بھائی چارہ اور خدمتِ خلق تھا اور اس شہر کا بادشاہ اور باشندے بھی مذہبی رواداری کا نمونہ تھے۔

دہلی سلطنت بڑے رعب ودبدبے کے ساتھ قائم ہوئی تھی۔ سلطان شمس الدین التمش شہنشاہ کے لباس میں ایک درویش تھا اور حضرت خواجہ قطب اللہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا مرید بھی تھا۔ خواجہ قطب صاحب کی خانقاہ میں مال ومتاع کچھ نہ تھا۔ آنے والوں کی تواضع کبھی صرف ایک گلاس پانی سے ہی کی جاتی تھی۔ مگر عوام میں ان کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب خواجہ اجمیری اپنے خلیفہ حضرت قطب صاحب کو ساتھ لے کر دہلی سے اجمیر جانے لگے تو سارا شہر دہاڑیں مار کر رورہا تھا جہاں ان بزرگوں کے قدم پڑتے تھے اس جگہ کی مٹی لوگ تبرک سمجھ کر اٹھالیتے تھے۔ شہنشاہ التمش بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ خلقِ خدا کی یہ بے قراری دیکھ کر حضرت خواجہ اجمیری نے

خواجہ قطب صاحب سے فرمایا کہ تم دہلی میں ہی رہو اس شہر کو تمہارے حوالے کرتا ہوں۔

خواجہ قطب صاحب کے جانشین اور خلیفہ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر علیہ الرحمہ ہوئے۔ انھوں نے کچھ وقت دلی اور ہانسی میں گذارا۔ آخر پنجاب کے ایک چھوٹے سے قصبے اجودھن کو اپنی خانقاہ کے لئے پسند فرمایا۔ یہ اب پاکستان کے ضلع ساہی وال میں ہے اور پاک پتن کہلاتا ہے۔ یہاں مختصر سی آبادی تھی۔ مسلمان تو گنے چنے ہی ہوں گے۔ اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔ زیادہ تر کھیت میں مزدوری کرنے والے، کپڑا بننے والے، مٹھائی بنانے والے ایسے ہی پیشہ ور لوگ تھے۔ اجودھن دریائے ستلج کے کنارے بسا ہوا تھا۔ یہاں سے دریائی مسافروں کے قافلے بھی گذرتے تھے۔ ستلج کا پاٹ برسات میں کئی میل چوڑا ہو جاتا تھا۔ اس لئے برسات آنے سے پہلے ہی لوگ اپنی کشتیاں بیڑے اور مجیرے تیار کر رکھتے تھے۔ برسات میں گیلی لکڑی سے بیڑے بنانا بھی دشوار ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسا عمل اور ایسی ضرورت تھی کہ اس علاقے کا معمولی سا آدمی بلکہ بچہ بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ اس پس منظر میں حضرت بابا صاحب کا یہ شبد پڑھئے جو گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہے۔

بیڑا بندھ ناسا کیو بندھن کی بین

بھر سر دور جب اوچھلے تب ترن دو ہیلا

فرماتے ہیں کہ جو بیڑے باندھنے کا موسم تھا اس وقت تو تم نے باندھے نہیں جب دریا بھر جائیگا اور پانی اچھلنے لگے گا تو تیرنا سخت دشوار ہوگا۔ اس پردے میں یہ تعلیم ہے کہ آخرت کو ایک دریا سے تشبیہہ دی ہے۔ زندگی میں جو مہلت ملی ہے اس میں کچھ عمل کرلو تو دریائے آخرت سے پار اتر جاؤ گے ورنہ سوائے ندامت کے کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔

حضرت بابا صاحب کی خانقاہ میں آدھی رات تک بھیڑ لگی رہتی تھی اور یہ آنے والے زیادہ تر غیر مسلم ہی ہوتے تھے۔ آپ ان سے ان کی زبان ہی میں گفتگو فرماتے تھے۔ چنانچہ پنجابی بان کی شاعری کا سب سے پرانا نمونہ بابا صاحب ہی کا کلام ہے جو سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ

صاحب میں بھی شامل ہے۔ بابا صاحب ان بے پڑھے لکھے محنت کش لوگوں کو ذکر اور جاپ کی تعلیم بھی ان کی زبان ہی میں دیتے تھے۔ ان سے منسوب یہ ذکر قدیم کتابوں میں ملتا ہے۔

ایہہ دل توں ...... اوہ دل توں ...... اِتھے توں ...... اُوتھے توں ...... توں ہی توں

یعنی اے اللہ اس عالم کا مالک بھی تو ہے اُس عالم (آخرت) کا والی بھی تو ہے۔ یہاں بھی تو ہے وہاں بھی تو ہے، بس تو ہی تو ہے۔

غور کیجئے کہ اس ذکر میں کتنی کیفیت اور کیسی جاذبیت ہے، کتنا ہی معمولی، بے پڑھا اور اجڈ انسان ہو اس سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ ان حضرات نے مقامی زبانوں کی اہمیت کو خوب سمجھ لیا تھا۔ صوفیا کا کلام ہندی، گوجری، بنگالی، سندھی، پنجابی، کشمیری زبانوں میں بکھرا پڑا ہے۔ یہ شاعری محض تفریح طبع کے لئے نہ تھی۔ بلکہ عوام کی رہنمائی اور ارشاد و ہدایت کے لئے تھی۔

ان بزرگوں کی خانقاہ میں جوگی بھی آیا کرتے تھے وہ ان سے تصوف کی معلومات حاصل کرتے تھے اور یہ بزرگ جوگیوں سے یوگا کے اصول پوچھتے تھے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ کی خانقاہ میں ایک بار کسی جوگی سے ملاقات ہوئی تو حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے اس سے دریافت کیا کہ تمہارے مسلک میں بنیادی بات کون سی ہے؟ جوگی نے کہا کہ انسان کے جسم میں ایک عالم علوی (بالائی حصہ) ہے دوسرا عالمِ سفلی (نچلا دھڑ) ہے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ اوپر کے حصے میں یعنی دل و دماغ میں صفائی، اخلاص، محبت اور سچائی رہے اور نچلے حصے میں پاکیزگی اور پرہیزگاری رہے۔ حضرت نظام الدین نے فرمایا کہ مجھے اس جوگی کی یہ باتیں بہت پسند آئیں۔

حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ کی خانقاہ میں بھی جوگیوں کا آنا جانا رہتا تھا اور آپ کے ملفوظات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آپ سنسکرت زبان سے بھی واقف تھے اور اس زبان کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔ ملفوظات میں یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ کسی نے آپ کے سامنے دوسرے شخص سے تو کہہ کر بات کی آپ نے اسے ٹوکا اور فرمایا کہ یہ بات کرنے کیا طریقہ ہے؟ اس شخص نے کہا کہ یہ ہندو ہے تو آپ کا چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور اس شخص کو ڈانٹتے ہوئے کہا کہ انسان بھی تو ہے۔

غور کیجئے کہ جو حضرات یہ گوارا نہ کر سکتے ہوں کہ کسی غیر مسلم سے تو کہہ کر بات کی جائے وہ غیر مسلموں کی دل آزاری کیسے برداشت کر سکتے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کہیں سے تشریف لا رہے تھے دیکھا کہ جمنا ندی کے قریب ایک عورت کنوئیں سے پانی بھر رہی ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ جب ندی سامنے ہے تو کنوئیں سے پانی کیوں بھر رہی ہو؟ اس

عورت نے جواب دیا کہ میرا گھر والا غریب آدمی ہے، گھر کا خرچ مشکل سے پورا ہوتا ہے، ندی کا پانی ہاضم ہے بھوک زیادہ لگتی ہے اسلئے ہم کنویں کا پانی پیا کرتے ہیں۔ یہ جواب سن کر حضرت نظام الدین اولیاءؒ بے چین ہو گئے، آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے اپنی خانقاہ میں آئے اور اپنے خادم اقبال سے فرمایا، گاؤں میں جاکر اس عورت کا گھر تلاش کرو اور اس سے پوچھو کہ ماہانہ خرچ میں کتنا گھاٹا رہتا ہے۔ اتنا روپیہ ہر مہینہ اسے خانقاہ سے بھجوایا کرو اور اس سے کہو کہ آئندہ وہ جمنا ندی کا پانی پیا کرے۔

خانقاہیں آج ختم ہو چکی ہیں اسلئے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ وہ کیسی تھیں اور وہاں کا نظام کیا تھا۔ خانقاہ ایک عبادت خانہ بھی تھی جہاں رہنے والے اپنے رب کی عبادت کرتے تھے اور اوراد و وظائف پڑھتے تھے۔ مراقبہ کرتے تھے، ریاضت کرتے تھے، روزے رکھتے تھے، چلے کھینچتے تھے، خانقاہ ایک مسافر خانہ بھی تھا جہاں باہر سے آنے والے قیام کرتے تھے انھیں کھانا کپڑا بھی ملتا تھا۔ بستر بھی، دوسری ضرورتیں بھی۔ خانقاہ، ایک مدرسہ بھی تھی جہاں کتابوں کا درس ہوتا تھا، اصول دین کی تعلیم دی جاتی تھی۔ خانقاہ، ایک تربیت گاہ تھی جس میں رہنے والوں کو اچھے اخلاق اور آداب سکھائے جاتے تھے۔ انکے ایک ایک عمل پر نظر رہتی تھی اور ان کی اصلاح کی جاتی تھی۔ خانقاہ ایک روحانی شفاخانہ بھی تھا جہاں بیماروں کو دوا اور دعا دونوں ملتی تھیں۔ کسی کو تعویذ دیا جاتا تھا۔ کسی کو عمل یا وظیفہ بتایا جاتا تھا کسی کے لئے باطنی توجہ کی جاتی تھی۔ خانقاہ ایک ایسی جگہ بھی تھی جہاں سماج کے ہر طبقے کے لوگ آکر ملتے تھے۔ ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے تھے۔ محبت، بھائی چارہ، رواداری اور دردمندی کا سبق سیکھتے تھے۔ آپس میں شیر و شکر ہو کر رہتے تھے اور ایک دوسرے کے مسائل سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ خانقاہ ایک لنگر خانہ بھی تھا جہاں فقراء، مساکین اور مسافروں کو بروقت کھانا ملتا تھا۔ بعض خانقاہوں میں تو دن رات لنگر جاری رہتا تھا۔ ایسے ادارے کی افادیت اور اچھائی سے کون انکار کر سکتا ہے جس میں بیک وقت اتنی خوبیاں موجود ہوں۔

آج ہمارے ملک کا سماجی ڈھانچہ بدل رہا ہے۔ ان تبدیلیوں سے کچھ تناؤ اور کشمکش بھی پیدا ہو رہی ہے ایسے حالات میں سب سے اہم رول خانقاہیں ہی ادا کر سکتی ہیں۔ ہمارے دیس کو نفرت کو نہیں پریم کی ضرورت ہے۔ توڑنے کی نہیں جوڑنے کی ضرورت ہے۔ پریم کا درس ایک صوفی دے سکتا ہے ایک بھکت دے سکتا ہے اور دلوں کو ملانے کا کام ایک خانقاہ ہی کر سکتی ہے۔ کسی فارسی والے نے لکھا تھا۔

دل شکستہ دراں کوچہ می کنند درست

چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

یعنی اس کوچے میں ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جاتے ہیں اور ایسے جوڑے جاتے ہیں کہ تم خود بھی نہیں پہچان سکتے کہ یہ کہاں سے ٹوٹا تھا۔

قومی تہذیب اور مذاہب

○

انسان ایک سماجی جاندار ہے۔ یہ بات سماجیات اور تہذیب کی تاریخ کا بنیادی پتھر اور ان علوم کی الف، ب، ت کی حیثیت رکھتی ہے۔ دوسرے حیوان انفرادی زندگی گذار سکتے ہیں لیکن انسان کی ضرورتیں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہیں۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس کی مثالیں دینا غیر ضروری ہے۔ ہم زندہ رہنے کے لئے دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں اور اپنے تحفظ کے لئے کسی مکان میں سر چھپاتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے اس کے لئے ہمیں کتنے انسانوں کی مدد درکار ہوتی ہے، اسی لئے مختلف پیشے وجود میں آئے ہیں اور محنت کو زر کا بدل بنالیا گیا ہے۔

ابتدائی انسان چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں رہا ہوگا جو بعد کو بڑے بڑے گروہ بن گئے۔ ان گروہوں کی تقسیم سے اس کی شناخت ہوتی ہے۔ یہی اسلامی نظریہ بھی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَجَعَلۡنٰکُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَاللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ

یعنی "ہم نے تمھیں قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کر کے بنایا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ مگر تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو"۔ اس سے ظاہر ہے کہ نسلی بنیاد پر کسی مجد و شرف کو اسلام قبول نہیں کرتا۔ معیار ہمارے اعمال ہو سکتے ہیں۔

جب اس کائنات کے خالق نے ہی انسان کو قبائل و اقوام میں تقسیم کر دیا ہے تو دنیا پر ایک

قوم کی مملکت کا قیام بھی ناممکن ہے۔ یہ ہمیشہ ایک خواب ہی رہے گا۔ لیکن اقوام کی تقسیم کا جو سبب بتایا گیا ہے وہ ایک منطقی اور عقلی دلیل ہے۔ لِتَعارفُوْا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو...... اور اصل مسئلہ یہی پہچان کا ہے جس نے تمام دنیا میں طرح طرح کے دوسرے مسائل پیدا کرر کھے ہیں۔ انسان نے جب سے تمدنی زندگی کا آغاز کیا ہے اس میں تشخص اور پہچان کی فطری خواہش برابر موجود رہی ہے۔ اسے تو آپ انفرادی کسوٹی پر بھی پرکھ کر دیکھ سکتے ہیں۔ ایک شخص آپ کو صرف مسٹر، شریمان جی، جناب یا لالہ جی یا پروفیسر صاحب کہہ کر مخاطب کرتا ہے اور دوسرا آپ کا نام لیکر آپ سے خطاب کرتا ہے۔ دونوں کی طرف آپ کا رویہ مختلف ہوگا۔ آپ اس شخص سے ذہنی قربت زیادہ محسوس کریں گے جو آپ کو نام لیکر اپنی طرف متوجہ کررہا ہے، اس لئے کہ اپنی بقاء اور پہچان انسان کی جبلت Propensity ہے اور یہی اس کی قوتِ مدافعت Defence کو اُبھارتی ہے۔

جس طرح آپ اپنے خاندان سے، اپنے پیشے اور فن سے یا اپنے عہدے اور مال و دولت سے یا اپنے مخصوص نظریات سے پہچانے جاتے ہیں، بالکل یہی حال قوموں اور ملتوں کا ہے۔ قوموں کی شناخت کے بہت سے معیار ہیں لیکن تین پیمانے سب سے بڑے اور عالم گیر ہیں۔ ایک جغرافیائی پہچان یا وطنیت، دوسری نسلی پہچان، تیسری مذہبی پہچان۔

اب اختلاف یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ہمارا تصور قومیت کیا ہے؟ یعنی ہم اپنی قومیت کو وطن سے جوڑیں یا نسل سے یا مذہب سے؟

قومیت کا جو تصور آج ہمارے سامنے ہے اور جس پر لمبی چوڑی بحث بھی ہوتی رہی ہے یہ زیادہ پرانا نہیں ہے اور اس نے ساری کھنڈت صرف تیسری دنیا میں یا مشرق میں ڈال رکھی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں بعض ایسے بھی ہیں جہاں ساری دنیا سے ترکِ وطن کرکے آئے ہوئے خاندان قابض ہوگئے ہیں اور انھوں نے ہی وہاں کا سماج بنایا ہے مگر اب

وہ اپنی پہچان پچھلے رشتوں سے نہیں کرتے، اپنے موجودہ وطن سے کرتے ہیں۔ اسی طرح مغربی ممالک میں مذہب کو قومیت کے تصور سے دور رکھا گیا ہے بلکہ سچ پوچھیئے تو وہاں قومیت کا ویسا جارحانہ تصور ہے ہی نہیں جس سے ہم متعارف ہیں۔

تیسری دنیا کا بڑا حصہ ایک طویل عرصے تک مغرب کی نوآبادی رہا ہے۔ خاص طور سے خلافت عثمانیہ جو تین بر اعظموں میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے خلاف محکوم علاقوں کا شعور بیدار کرنے کے لئے ان سامراجی قوتوں نے تصور قومیت کا سہارا لیا تھا تاکہ مغربی طاقتوں کو ان علاقوں میں اپنے قدم جمانے کا موقع مل جائے اور یہاں کے باشندے قومیت کے نام پر لڑتے رہیں۔ اس تصور قومیت نے خلافتِ عثمانیہ کو تو ختم کر دیا اور سلطنتِ عثمانیہ یوروپ کی بڑی طاقتوں میں بٹ گئی مگر یہ تصور قومیت خود عربوں کو آج تک متحد نہ کر سکا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اُسے ایک غلط سیاسی مقصد کے لئے ابھارا گیا تھا۔

قومیت کا وطنی تصور ایک ذہنی اور نفسیاتی تصور ہے جس کی بنیاد جذباتی ہوتی ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں جہاں مختلف نسلوں کے لوگ اور مختلف مذاہب کے ماننے والے بستے ہوں، یہ قو... ے مذہبی تصور سے زیادہ تعمیری اور عقلیت پسندی Rationality کی طرف لے جانے والا ہوتا ہے کیونکہ اگر ہم قومیت کی شناخت نسل یا مذہب کے واسطے سے کریں تو اختلافات اور نفرتوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وطنیت پر مبنی قومیت ایک سیکولر نظریہ ہے مگر لادینی تشخص کو مشکل ہی سے کوئی تشخص مانا جا سکتا ہے۔ یہاں اس کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے سیکولرازم کے تصور کو زیادہ واضح کریں اور اس کی بنیادیں عقلیت پر رکھیں۔ سیکولرازم کا مفہوم بے دینی، لامذہبی، یا مذہب کا انکار کرنا نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت اور سماجی قوانین کے بارے میں مذہبی اداروں سے رہنمائی حاصل نہیں کی جائیگی لیکن سب مذاہب اپنے اپنے دائرے میں پوری آزادی سے پھلتے پھولتے رہیں گے مگر ہمارے بعض رہنماؤں نے بھی سیکولرازم کا مفہوم نہیں سمجھا ہے اور ان کی طرف سے ایسے مطالبے سامنے آتے

ہیں جو سیکولرازم سے مطابقت نہیں رکھتے۔

مغربی سامراج نے مشرقی نوآبادیوں میں قومیت کے تصور کو خوب خوب اچھالا...... یہ ایک سیاسی چال تھی۔ اس کا پہلا اثر تو اسی پہچان کے نام پر جزوی آزادی کا مطالبہ ہوتا ہے، پھر اس کی لے بڑھتی ہے تو وہ مکمل آزادی کے راگ الاپنے لگتے ہیں۔ نعرہ بہت خوبصورت اور دل فریب ہے، اس لئے یہ شہد میں گھلی ہوئی زہر کی پُڑیا آسانی سے حلق کے نیچے اتر جاتی ہے مگر اس کے زہریلے اثرات دیکھئے کہ آج چھوٹے چھوٹے علاقے اور اضلاع بھی اپنی انفرادی پہچان پر اصرار کرتے ہیں۔ سوچئے یہ اتحاد ہے یا ایک بڑی طاقت کا ٹکڑوں میں بٹ جانا ہے؟ پہلے زمانے میں انسان اپنی بہادری کے بَل پر دنیا کو فتح کرتا تھا اور حکومت چلاتا تھا لیکن آج طاقت کا مفہوم بھی بدل چکا ہے۔ اب انسان کی ذہانت اور اس کی دولت حکومت کر رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں کمزور قوموں کا وجود اسی وقت باقی رہ سکتا ہے جب ان کے سماج کی بنیاد توہمات پر نہ ہو، حقائق پر ہو، وہ مزاج کے اعتبار سے عقلیت پسند ہوں۔ یہی چیز ان کی وحدت کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ وحدت ہوگی تو اقتصادی حالات بھی بہتر ہونگے۔ اس طرح نئے دور کی غلامی کا مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں اپنے محدود نظریات کے خول سے باہر نکلنا ضروری ہو گیا ہے۔ کوئی اتحاد محض جذباتی نعروں سے پیدا نہیں ہوا کرتا۔ وہ ایک وقتی لہر ہوتی ہے جسے ہم غلطی سے اتحاد یا یکجہتی سمجھ بیٹھے ہیں۔ یہ جتنی آسانی سے پیدا ہوتا ہے اتنی ہی سہولت سے ختم بھی ہو جاتا ہے۔ قومی اتحاد کی بنیاد تاریخی شعور پر ہونی چاہئے۔ اگر ہم نے واضح تاریخی شعور پیدا کر لیا ہے تو دوسرے تمام فرقوں، مذہبوں اور نسلوں کے تاریخی رول کو انصاف کی نظروں سے دیکھ سکتے ہیں۔ اور یہ تاریخی شعور ہی ہمارے اندر آفاقی اجتماعی تصور پیدا کر سکتا ہے۔

ایک ایسی سوسائٹی میں جہاں مختلف طبقات کے لوگ رہتے ہیں سب سے بڑی ضرورت عدل وانصاف ہی کی ہے۔ اقلیتوں کو عموماً یہی شکایت ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ یہ منصفانہ نظر بھی تاریخی شعور سے پیدا ہوتی ہے۔ ہر مذہب کو خود اس مذہب کی عینک سے

دیکھنا چاہئے۔ دشواری وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں ہم اپنے مذہب کی عینک لگا کر دوسرے مذہب کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔

اگر ہم مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان رہ رہے ہیں تو سماجی معاملات میں ہمارا سیکولر نظریہ بہت ضروری ہو جاتا ہے مگر اس کی فکری بنیاد ہونا بھی کم ضروری نہیں ہے، اس لئے کہ وہ مذہب کا متبادل بن کر آتا ہے۔ مذہب ہماری اجتماعی فکر کا نام ہے۔ اس کی جگہ کوئی ایسا نظریہ نہیں لے سکتا جو اصول پر مبنی نہ ہو اس لئے بھی تاریخی شعور کی اہمیت ہے کیونکہ تاریخی شعور کسی حد تک مذہبی فکر کی جگہ لے سکتا ہے۔

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذہب اور قوم پرستی میں تضاد ہے یا نہیں؟ بعض مفکرین قوم پرستی کو ایک بشری حقیقت کہتے ہیں اور بعض اسے جغرافیائی مظہر بتاتے ہیں لیکن اگر ہم دونوں باتوں کو بیک وقت صحیح تسلیم کرلیں تب بھی کیا قباحت ہے۔ ہمارے سماج کی اصلی اور بنیادی ضرورت استحکام ہے اور وہ اجتماعی بھلائی سے حاصل ہوتا ہے۔ وہ ممالک جنھیں تیسری دنیا کہا جاتا ہے اپنا اقتصادی بلاک بنانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں اور یہ اجتماعی اقتصادی منصوبہ بندی سے ہی ممکن ہے۔ اسی سے وہ راستہ بھی کھلے گا جو ہمیں سوشلزم کی منزل تک لے جا سکتا ہے۔ سوشلزم ہمیں بھی مطلوب ہے مگر ہم نے اسے مذہبی فکر سے آزاد کر کے قبول نہیں کیا ہے۔ اس لئے ہمارا وہی قومی تصور صحت مند، پائیدار اور اجتماعی بھلائی کا ضامن ہوگا جس میں انفرادی آزادی ہو، ثقافتی اور مذہبی آزادی ہو اور جس کی بنیاد تاریخی شعور اور اجتماعی عدل پر رکھی گئی ہو، ایک ایسے سماج میں جہاں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہوں، طبقات کی تقسیم بہت نمایاں ہو، کلچر مختلف ہوں۔ مذہبی رسوم و عبادات میں اور نظریۂ حیات و کائنات میں زمین آسمان کا فرق ہو۔ تہذیبی جارحیت باقی رہیگی تو کبھی بھی توازن پیدا نہیں ہو سکتا۔ ایسے سماج میں تصور قومیت کو ایک رومانی رنگ دینے کی ضرورت ہے۔

مذہب کی کمزوری احیاپسندی ہے جس کے ساتھ جارحیت اور تشدد کا پرانا رشتہ ہے اور یہ قومی وحدت کی سخت دشمن ہے۔ اسی احیاپسندی کا ردّ عمل علحدگی پسندی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے

اس دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے یہ انسان کی تمدنی اور معاشرتی زندگی کی دین ہے۔ اسے باقی رکھنا ہے تو ہمیں عمرانیات کی بنیادوں کو سمجھنا ہوگا۔ مشہور اسلامی مفکر ابنِ خلدون کہتا ہے کہ اس کی پہلی بنیاد تو اجتماعیت ہے کہ سماج میں افتراق پیدا نہ ہو اور لوگ مل جل کر رہنے کی ضرورت کو سمجھتے ہوں۔ دوسری بنیاد سماج کا دفاع کرنا ہے۔ جو مخالف قوتیں اس وحدت کو درہم برہم کرنے والی ہیں، ان کا مقابلہ کرنا اور انھیں دور کرنا سماج کے ہر فرد کا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وحدت نہیں ہوگی تو مخالف قوتوں کا مقابلہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک فطری احتیاج ہے اور اس کے لئے انسان ایک نظام دفاع کی اطاعت کرنے پر مجبور ہے۔

اس کے بعد تین بڑے عوامل Factors ہیں جو انسانی زندگی کی سمت اور اس کا مقصد متعیّن کرتے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا نمبر مذہب کا ہے، دوسرا جغرافیائی حالات کا اور تیسرا وسائلِ حیات یا اقتصادی نظام کا۔ مذہب کو ایک فضول چیز اور شر کا سرچشمہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ ایک قوت Force ہے۔ یہ ہماری توفیق پر منحصر ہے کہ ہم اس طاقت کا استعمال کہاں اور کیسے کرتے ہیں؟ سائنس کی زندگی دو، تین سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہے اور اس مختصر سی مدت میں اس نے ہلاکت کے جو سامان پیدا کر دیئے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ سائنس کی آنے والی زندگی بھی زیادہ نہیں ہے۔ سائنس کیا خود کائنات کے سر پر بال میں بندھی ہوئی تلوار لٹک رہی ہے۔ مذہب نے صدیوں تک انسان کا ساتھ دیا ہے۔ دُکھ سکھ میں اور اچھے بُرے وقتوں میں رہنمائی کی ہے اور وہ آج بھی بے جان نہیں ہے۔ ابھی صدیوں تک انسان کو راستہ دکھا سکتا ہے۔ صرف اسے موثر بنانے کی ضرورت ہے۔ آج امنِ عالم اور بقائے باہم ساری دنیا کا مسئلہ ہے۔ اس میں جتنا اہم رول مذہب ادا کر سکتا ہے اتنا دوسری کوئی طاقت نہیں کر سکتی لیکن ایک ایسے سماج میں جو تہذیبی اور مذہبی رنگارنگی سے ممتاز ہے ہمیں مذہبی احیا پسندی کو قومیت اور اجتماعیت کے عالم گیر تصورات سے دور رکھنا ہوگا۔

ہماری قومی تہذیب کی شناخت مذہب سے کرنا غیر فطری ہوگا۔ یہاں تو یہ دیکھنا ضروری

ہے کہ ہمارے وسائلِ پیداوار کیا ہیں اوران کی منصفانہ تقسیم کس طرح ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کی تہذیبی کثرت سے جو قومی وحدت کا تصور اُبھر سکتا ہے اس کا آفاقی اقدار پر مبنی ہونا ضروری ہے۔ وہ تاریخ اور اقلیت پر استوار کیا گیا ہو اور اجتماعی مفاد اس کا مطمحِ نظر ہو۔ ایک جمہوریت اسی وقت سچی جمہوریت بنتی ہے جب اس میں کسی کو محکوم و مغلوب ہونے کا احساس باقی نہ رہے اور جہاں اکثریت کا عمل انصاف کے فطری تقاضوں کے مطابق ہو۔ جمہوری ملک کے ہر فرد کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ حکومت کی مشین کا ایک پرزہ ہے۔ اگر یہ تاثر عام ہو جائے کہ چند افراد یا کوئی مخصوص طبقہ اس کے فائدے حاصل کر رہا ہے اور دوسروں کا استحصال کر رہا ہے تو ایسی جمہوریت کھوکھلی ہوتی جاتی ہے اور اس کے قومی تصور پر علحدگی پسندی کے کالے سائے منڈلانے لگتے ہیں۔

مذہب کے بارے میں بھی یہ جان لینا چاہئے کہ یہ کوئی مجرّد Abstract حقیقت نہیں ہے، معاشرے کا ایک فعال عنصر ہے اور یہ سماج کا ذہن ہی نہیں اس کا ضمیر بن جاتا ہے۔ ہم خیر و شر، پاپ اور پُنّہ کا واضح تصور پیدا کئے بغیر ایک صحت مند سماج نہیں بنا سکتے اور مذہب کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ وہ ہمیں نیکی و بدی کو پرکھنے کے معیار دیتا ہے۔

دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہمیشہ افراد کے ذہنوں سے پھوٹے ہیں اور انھیں یہ عظیم انقلابی قوت مذہب نے ہی دی ہے جس کے سامنے مادی طاقتیں بھی ششدر رہ جاتی ہیں۔ اگر تاریخی شعور اور اجتماعی اقدار کے ساتھ مذہب کی بے پناہ قوت کو سماجی تعمیر میں لگایا جائے تو اس سے قومی تہذیب یا نیشنل کلچر کا کوئی تصادم نہیں ہے بلکہ اس سے شوکت و طاقت حاصل ہوتی ہے لیکن صرف مذہبی احیا پسندی یا تہذیبی جارحیت یا فرقہ وارانہ علحدگی پسندی کبھی بھی قومی تہذیب بدل نہیں بن سکتی۔ نہ وہ ہمیں ایسی وحدت دے سکتی ہے جس سے ہمارے سماج کا تحفظ ہو سکے اور زندگی کی آسائشیں عام آدمی تک پہنچ سکیں۔

تصوف اور ویدانت

(تقابلی مطالعہ)

○

ہمارے اس بر صغیر میں کئی آزاد ملک ہیں ، چھوٹے بڑے درجنوں مذاہب ہیں ، بھانت بھانت کی سماجی رسمیں ہیں۔ تقریباً (20) بڑی زبانیں اور پانچ سو سے زائد علاقائی بولیاں ہیں۔اسی طرح مختلف نسلیں ہیں مگر اس کثرت میں وحدت کا ایک پائیدار رشتہ بھی موجود ہے ، یہ وحدت رسوم و ظواہر میں چاہے نظر نہ آئے مگر افکار میں یقیناً بہت نمایاں ہے۔اس کا اندازہ غور و فکر کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔

تصوف ایک ایسا میدان ہے جس میں ہم فکر و عمل کی یکسانی اور یگانگت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں تصوف کے تین بڑے سلسلوں کا نشو و نما ہوا ہے یعنی چشتی، سہروردی اور نقشبندی۔ چشتی سلسلہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری ؒ کے ذریعہ شائع ہوا، سہروردی سلسلہ کو حضرت شیخ الاسلام بہاالدین زکریا ملتانی ؒ نے رائج کیا جو ۶۱۷ھ میں حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی ؒ (متوفی ۶۳۲ھ) سے خلافت و اجازت حاصل کر کے آئے تھے اور ملتان کو اپنا مرکز بنایا تھا ۔ نقشبندی سلسلہ حضرت خواجہ باقی باللہ ؒ کے جانشین حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی ؒ اور انکے خاندان کی کوشش سے ہوا۔

سہروردی بزرگوں نے سلوک و تصوف میں تصانیف اور درس و تدریس پر زیادہ توجہ کی اور طبقہ امراء سے ہی تعلقات رکھے ،اس لئے وہ عوامی نہ بن سکا۔

نقشبندی بزرگوں نے قلب وروح کی صفائی اور ذکر و فکر کے ساتھ مریدوں کی تربیت کی۔
انھوں نے عوام اور امراء دونوں سے ربط رکھا، مگر یہ وعظ و اصلاح اور احتساب کی حد تک رہا۔

چشتی بزرگوں نے کتابی علم کو ضروری سمجھا مگر اس کے ساتھ عمل صالح پر زور دیا۔ تربیت اور تہذیب و اخلاق کے لئے جماعت خانے بنائے۔ شاہانِ وقت اور امیروں سے کوئی تعلق نہیں رکھا، نہ ان کی دی ہوئی جاگیریں اور منصب قبول کئے۔ اپنے تربیت یافتہ مریدوں کو خلافت دے کر مرکزی جگہوں پر خدمت کے لئے بھیجا اور ہر حال میں عوام سے گہرا اور سیدھا رشتہ بنائے رکھا۔ عوام سے تعلق کے لئے ضروری تھا کہ ان کی معاشرت سے واقفیت ہو، ان کے سوچنے سمجھنے کا معیار معلوم ہو، جو رسمیں، توہمات اور ٹوٹکے ان کی سماجی زندگی میں رچے بسے ہیں ان کا علم ہو، اور یہ صرف اُن کی زبان جاننے سے ہی ممکن تھا۔

ہمارے صوفیا ہندوستان کی علاقائی اور عوامی زبانوں سے واقف تھے۔ اس کی شہادت پرانی کتابوں سے مل جاتی ہے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ اپنے مریدوں کو پنجابی زبان میں ذکر کی تلقین فرماتے تھے۔

اِتھے توں [یہاں بھی تو ہے] اُتھے توں [وہاں بھی تو ہے] توں ہی توں [تیرے سوا کوئی نہیں ہے] یہ ذکر سہ ضربی کہلاتا ہے۔ اسے پنج ضربی کرنے کے لئے یہ اضافہ کرتے تھے: جتھے دیکھوں تتھے توں [جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے] پھر توں ہی توں، توں ہی توں، کی تکرار۔

حضرت بابا فریدؒ کا عارفانہ پنجابی کلام گورو گرنتھ صاحب میں موجود ہے جس میں تصوف کے بہت لطیف مسائل کو اس طرح سمجھایا ہے کہ عام آدمی بھی ان باریکیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً ایک اشلوک میں یہ تعلیم دیتے ہیں اس زندگی کے بعد بھی آخرت کی زندگی ہے، اس کے لئے ابھی سے تیاری کرنا ضروری ہے ورنہ سوائے ندامت کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس بات کو اس علاقے کے باشندوں کی معاشرت اور روزمرہ کے پردے میں یوں بیان کیا ہے:

بیڑا بندھ نا سا کیو بندھن کی بیلا ‏ ‏ ‏ بھر سروَر جب اُوچھلے تب ترن دو ہیلا

برسات میں ستلج ندی کا پاٹ میل چوڑا ہو جاتا تھا، اس علاقے کے رہنے والے برسات آنے سے پہلے ہی کشتیاں بنا کر رکھ لیتے تھے جس سے دریا پار کر سکیں۔ بابا صاحبؒ فرماتے ہیں کہ جو بیڑے باندھنے کا سمے تھا اس وقت تو تیار کیئے نہیں جب دریا بھر کر اچھلنے لگا تو پار کرنا دشوار ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ اس علاقے کے عوام خوب سمجھ سکتے ہیں۔

حضرت بابا فریدؒ کی خانقاہ میں جوگی بھی آتے تھے اور ان سے افکار کا تبادلہ ہوتا تھا۔ ایک بار ایک جوگی ان کی خدمت میں آیا، حضرت نظام الدین اولیاؒ وہیں تھے۔ انھوں نے اس سے پوچھا کہ تمہارا طریقہ کیا ہے؟ اور تمہارے نزدیک بنیادی بات کیا ہے؟ اس نے کہا کہ ہمارے شاستروں میں یہ لکھا ہے کہ انسان کی شخصیت میں دو۲ عالم ہیں، ایک عالمِ بالا، دوسرا عالمِ زیریں۔ سر سے ناف تک عالمِ بالا ہے اور ناف سے پیروں تک عالمِ زیریں ہے۔ ہونا یہ چاہیے کہ عالمِ بالا میں سچائی، صفائی اور اچھے اخلاق رہیں اور دوسروں سے اچھا برتاؤ کرے۔ نیچے کی دنیا میں نگہداشت، پاکی اور پارسائی رہے۔ حضرت نظام الدینؒ نے فرمایا کہ مجھے اس جوگی کی یہ باتیں بہت اچھی معلوم ہوئیں۔

خود حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خانقاہ میں بھی جوگیوں اور برہموں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ اس زمانے کی ایک تصنیف 'قوام العقائد' سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار چھ جوگی آپ کی خانقاہ میں آئے اور دہلیز پر مراقبہ کرنے بیٹھ گئے۔ یہ سب برسوں سے کسی پہاڑ کی کھوہ میں سمادھ لگائے ہوئے تھے اور غیبی اشارہ پاکر حضرت کی خانقاہ میں آئے تھے۔

ایک برہمن حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں آیا اور مراقبہ کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت نے فرمایا: اس قوم میں ایسے لوگ بھی ہیں!

حضرت سید محمد حسینی گیسو درازؒ کے ملفوظات جوامع الکلم سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سنسکرت زبان سے واقفیت حاصل کی تھی اور سنسکرت کی بعض کتابوں کا مطالعہ کیا تھا۔

بعد کے زمانے میں ہم حضرت شیخ محمد غوث گوالیاریؒ کا تذکرہ کر سکتے ہیں جنھوں نے صوفیا کے اعمال و مجاہدات میں یوگا سے پورا فائدہ اٹھایا اور بحر الحیات کے نام سے سنسکرت کی کتاب

امر کنڈ کا ترجمہ کیا، اس میں یوگا کے وہ اعمال بتائے ہیں جن سے روحانی لشکر کو جسمانی سپاہ پر فتح نصیب ہو سکتی ہے۔ عہدِ مغلیہ میں حضرت شیخ مجیب اللہ الہ آبادی ، شہزادہ داراشکوہ قادری، حضرت شاہ عضید الدین امروہویؒ، حضرت خواجہ شاہ عبدالہادی امروہویؒ ،وہ بزرگ ہیں جو ویدانت، اپنشد، جیوتش، یوگ وغیرہ ہندوستانی علوم کا نہ صرف علم رکھتے تھے بلکہ ان موضوعات پر صاحبِ تصنیف بھی ہیں۔

داراشکوہ نے مجمع البحرین جیسی فکر انگیز کتاب لکھی جس میں اسلامی فکر اور ہندوستانی فلسفے کی مشترک باتوں کو دل نشین اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ داراشکوہ نے (۵۲) اپنشدوں کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا اور " سِرِ اکبر" اس کا نام رکھا۔ یہ کتاب ایران میں چھپ چکی ہے۔ حضرت شاہ عضید الدین نے اجودھیا میں رہ کر باقاعدہ سنسکرت کی تعلیم حاصل کی تھی اور ایک کتاب "ستیہ سرور" لکھی تھی جو اب ناپید ہے۔ ان کی فارسی تصنیف مقاصد العارفین تصوف کے نظریاتی مسائل پر اعلی درجے کی کتاب ہے۔ یہ میرے مقدمے کے ساتھ شائع ہو چکی ہے۔ حضرت شاہ عبدالہادی امروہویؒ آخر عہد مغلیہ میں چشتی سلسلے کے جلیل القدر بزرگ ہوئے ہیں۔ ان کے حالات و ملفوظات میں سید نثار علی بخاری بریلویؒ کی تالیف "مفتاح الخزائن" ہے۔ شاہ عبدالہادیؒ نے اپنے مرید اسمولی کے کرپا رام کی فرمائش پر ایک کتاب "مقصود الطالبین" لکھی تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستانی جیوتش پر گہری نظر رکھتے تھے۔

صوفیا کے لٹریچر میں اس طرح کی ہزاروں مثالیں مل جائیں گی۔ ملفوظات میں ہندی اور سنسکرت کے الفاظ ہی نہیں، دوہے بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ان بزرگوں کی خانقاہ میں محفلِ سماع ہوتی تھی تو ہندی کلام بھی اپنایا جاتا تھا۔ حضرت گیسو درازؒ نے فرمایا کہ ہندی کلام رقت طاری کرتا ہے یعنی اس کے اثر سے رونا زیادہ آتا ہے۔

تصوف پر گفتگو کرتے ہوئے اُپنشدوں کا تذکرہ لازمی ہے۔ اُپنشد کے لفظی معنی ہیں کسی کے پاس باادب ہو کر بیٹھنا۔ اسی کو "ارادت" کہتے ہیں اور قرآن مجید میں یوں کہا گیا ہے:

کُونُوا مَعَ الصَّادِقِین (IX۔۱۱۷) سچے لوگوں کے ساتھ رہو۔

اُپنشدوں کی تعداد میں اختلاف ہے۔ کل ۱۰۸ ہیں۔ ایک اُپنشد کا اکبر اعظم کے عہد میں اضافہ ہوا، اسے "اللہ اُپنشد" کہا گیا۔ شنکر اچاریہ نے گیارہ اُپنشدوں کو اہم اور بنیادی مانا ہے۔ سر رادھا کرشنن نے (۱۸) اُپنشدوں کی شرح کی ہے اور دارا شکوہ نے (۵۲) کا فارسی ترجمہ کیا ہے۔

اب فکری ہم آہنگی دیکھئے۔ اپنشد میں خدا کو "ایکم اَدْوِیتم" کہا گیا ہے۔ لاالہ الا اللہ کا بھی بالکل یہی مفہوم ہے۔ اُپنشد کہتے ہیں کسی شئے کا وجود حقیقی نہیں۔ یہ صانع کی صفت خلاقی کا کمال ہے کہ اس نے کائنات کو مرتبۂ وہم میں تخلیق کیا ہے۔ یعنی اس کا وجود حسیَ ہے، اسے نمود تو حاصل ہے وجود حاصل نہیں۔ اس کی مثال یہ ہے کہ برف مرتبۂ شہود میں موجود ہے پگھل جائے تو پانی رہ جاتا ہے، برف کا علحدہ کوئی وجود نہیں۔ یا اگر کسی لکڑی کے ایک سرے پر کپڑا باندھ کر اسے جلائیں اور لکڑی کو تیزی سے گھمائیں تو آگ کا ایک دائرہ گردش کرتا ہوا نظر آئیگا۔ ہاتھ روک لیں تو دائرہ غائب ہو جائیگا۔ یعنی اس کا بھی وجود نہیں، صرف نمود ہے۔ صوفیا بھی یہی کہتے ہیں کہ واجب الوجود صرف ذات مطلق ہے۔ لا موجود الا اللہ لا موثر فی الوجود الا اللہ۔

اُپنشدوں کی رو سے وہ حقیقت اعلیٰ پرم یعنی حقیقت مطلقہ ہے جس کے ساتھ کسی اضافت کی دوئی بھی نہیں ہے، صوفیا اسے ذاتِ بحت کہتے ہیں وہ ستیہ ستیم (حقیقت الحقائق) ہے۔ جیوتشم جیوتش (نور علیٰ نور) ہے اسی کو قرآن نے یوں کہا ہے کہ الله نور السمٰوٰتِ والارض اور مثل نورہ کمشکوۃ فیھا مصباح۔

اُپنشد کہتے ہیں کہ وہ ذات بحت ظاہر بھی ہے، باطن بھی ہے، زمان و مکان اور علت و معلول کی بندشوں سے آزاد ہے۔ اسی کو قرآن نے ھوالاول ھو الاخر ھوالظاھر ھوالباطن کہا ہے اور یہی مفہوم الله لاالہ الاھوالحی القیوم کا ہے۔

اُپنشد کہتے ہیں کہ وہ سَروویاپی (محیط کل) ہے۔ انتریامی (بھیدوں کا جاننے والا ہے) یہی قرآن کہتا ہے: یعلم مابین ایدیھم وما خلفھم اور الله من ورائھم محیط۔

اُپنشد کہتے ہیں کہ اُسے آنکھ سے نہیں دیکھ سکتے۔ قرآن بھی یہی کہتا ہے کہ لا یدرکہ الابصار وھو یدرك الابصار (اسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں، وہ آنکھوں کو دیکھتا ہے)

اُپنشدوں کی رو سے ویراگ اور سنیاس بہترین طرزِ حیات ہے۔ یہی صوفیا کا ترک کا فلسفہ ہے کہ دنیا میں مسافر اور پردیسی کی طرح رہو، یہاں کی لذتوں میں گرفتار نہ ہو جاؤ۔ اُپنشد کہتے ہیں کہ انسان کے حقیقی دشمن یہ ہیں: نفسِ امارہ، خواہشات نفسانی، غضب، (کرودھ) حرص، لالچ، گھمنڈ۔ جو ان پر قابو پالے اُسے نفس مطمئنہ حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر وہ ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھتا ہے۔ کسی سے نفرت نہیں کرتا، دوسروں کی خدمت کیلئے جیتا ہے۔ صوفیا بھی یہی کہتے ہیں کہ حقیقی توحید ماسوا اللہ کا ترک کرنا ہے۔ خدا کی محبت کے ساتھ کسی دوسری شئے کی محبت دل میں نہیں رہ سکتی۔

اُپنشدوں کی رو سے عرفان حاصل کرنے کے لئے ضبطِ نفس، ایثار، شفقت، ذکر مجاہدہ اور مراقبہ ایسے وسیلے ہیں جو حقیقت مطلقہ تک پہنچاتے ہیں۔

ذاتِ حق کا ٹھکانا انسان کے قلب میں ہے۔ کتابوں سے صرف علم حاصل ہوتا ہے اور کورے علم سے ذاتِ حق تک رسائی نہیں ہو سکتی، اس کے لئے عشق کی ضرورت ہے۔

پوتھی پڑھ پڑھ جگ موا پنڈت بھیانہ کوئے
ڈھائی اکھشر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے

یہی صوفیا کا فلسفہ ہے کہ:

عشق رائو حنیفہ درس نگفت
شافعی را درو، روایت نیست

اُپنشد کی رو سے دھرم کی روح یہ جاننا ہے کہ "ایشور میرے اندر جلوہ گر ہے" اسی کو صوفیا یوں کہتے ہیں کہ: مَنْ عَرَفَ نفسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

سارے مجاہدات کا خلاصہ اُپنشد یہ بتاتے ہیں کہ سب سے پریم اور محبت پیدا ہو جائے۔ کینہ، کپٹ، نفرت اور دشمنی کی سیاہی سے دل کا آئینہ پاک صاف ہو جائے۔ تصوف کا مقصد بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ صوفیا کہتے ہیں کہ الخلق عیال اللہ، ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ اگر کوئی اللہ سے محبت کا دم بھرتا ہے اور اس کی مخلوق سے نفرت کرتا ہے تو وہ اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔

حضرت شیخ محب اللہ الہ آبادیؒ نے دارا شکوہ کے خط کے جواب میں لکھا تھا: ''سچ تو یہ ہے کہ حاکموں کو ہمیشہ خلق خدا کی بھلائی کا خیال رہے، مخلوق چاہے مومن ہو یا کافر، اللہ کی امانت ہے اور اس بات کی سند کہ حاکم ہر نیک و بد، مومن و کافر پر مہربان رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت عام ہے جن کے لئے قرآن میں آیا ہے: وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ (ہم نے آپ کو تمام عالموں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور اللہ بھی سب عالموں کا رب (پالن ہار) ہے، اس کی رحمت کے لئے بھی کسی کی تخصیص نہیں ہے''۔

صوفیا کے ملفوظات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو ایسی ہزاروں مثالیں مل جائیں گی کہ انھوں نے عام انسانوں، مسکینوں، فقیروں، دردمندوں کے دُکھ کو بانٹا ہے، ان کی خدمت اللہ کو خوش کرنے کے لئے کی ہے۔ دہلی میں ایک درویش شیخ بایزید اللہ ہوؒ تھے یہ قصور کے رہنے والے تھے، ننگے پانو، ننگے سر، ایک چادر اوڑھے، لال تہمد باندھے، اللہ ہو، اللہ ہو، کا نعرہ لگاتے ہوئے دلّی کے گلی کوچوں میں گھوما کرتے تھے۔ اگر کوئی بیمار نظر آتا تھا تو اس کی تیمارداری میں لگ جاتے تھے۔ ایک دن بازار میں کسی بوڑھی عورت کو دیکھا جو شدید بیماری سے کراہ رہی تھی، اس سے پوچھا تمہارا کوئی رشتہ دار ہے؟ اس نے کہا کوئی نہیں ہے۔ درویش نے اس بیمار عورت سے اپنا نکاح پڑھوایا اور اسے کندھے پر سوار کر کے اپنے تکیے میں لے آئے، اسے دھلایا، پاک صاف کیا اور اس کی دوا دارو کرنے لگے۔ ایک ہفتہ میں وہ صحت یاب ہو گئی تو اس کے مہر ادا کر کے طلاق دیکر رخصت کر دیا۔ چلتے وقت وصیت کی کہ نماز روزے کی پابندی کرنا اور عصمت و عفت کی حفاظت کرنا۔

یہی وہ اعمال ہیں جنھوں نے صوفیا کو عوام کے ہر طبقے میں مقبول بنایا، حضرت داتا گنج

بخش لاہوریؒ ہوں یا بابا فرید گنج شکرؒ حضرت سلطان باہوؒ ہوں یا میاں شاہ میرؒ۔ اسی طرح ہندوستان میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ قطب الدین بختیارؒ، خواجہ نظام الدین اولیاءؒ، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلیؒ، حضرت گیسو درازؒ، حضرت اخی سراجؒ، حضرت شیخ احمد عبدالحقؒ، حضرت مخدم علی احمد صابرؒ، حضرت شاہ عبدالہادیؒ، حضرت شاہ عبدالباریؒ۔ ان سب درویشوں کا سکہ اِدھر اُدھر سب طرف چل رہا ہے۔ ان کی مقبولیت کسی جغرافیہ کی قید میں نہیں ہے، نہ کسی سیاسی تفریق سے متاثر ہے۔

پاکستان سے ہر سال ہزاروں عقیدت مند اجمیر، کلیر، سرہند اور دہلی کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کے لئے آتے ہیں تو ہندوستان سے اولیاء اللہ کے دوست پاک پتن، لاہور، تونسہ، مہاراں اور گولڑہ جیسی درگاہوں پر جاتے ہیں۔ یہ ہے برصغیر کی مشترک وراثت، وہ قیمتی سرمایہ جسے صدیوں کے اُتار چڑھاؤ نے نہایت خاموشی کے ساتھ جمع کیا ہے اور ہمارے تہذیبی خزانوں میں اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ حکومتیں بنتی بگڑتی رہیں گی مگر ان کی حکومت زمان و مکان کی قید سے آزاد دلوں کی دنیا میں پائیدار رہے گی۔ فارسی والا کہتا ہے کہ :

اگر گیتی سراسر باد گیرد
چراغ مقبلاں ہرگز نمیرد

اگر ساری دنیا آندھیوں کی لپیٹ میں آجائے تو بھی اللہ کے مقبول بندوں کا چراغ نہیں بجھ سکتا۔

مذاہبِ عالم کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت

○

پہاڑوں کی کھوہ سے نکل کر چاند کی خاک چھاننے تک انسان نے ایک طویل سفر کیا ہے اور اس سفر کے ہر مرحلہ میں وہ کسی نہ کسی شکل میں مذہب کو بھی مانتا رہا ہے اس لئے مذہب کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی زندگی۔ جس طرح ہر قوم اور ہر علاقے کا کلچر مختلف ہے اسی طرح مذہب میں بھی اختلاف ہے بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ جیسے ایک انسان کی شکل دوسرے سے کلّی طور پر نہیں ملتی اس طرح ہر شخص کا عقیدہ بھی کچھ نہ کچھ انفرادی خط وخال رکھتا ہے۔ اس لئے ہم خواہ انسان کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کا مطالعہ کریں یا کسی کی شخصیت اور سیرت و کردار کو موضوع بحث بنائیں دونوں صورتوں میں مذہب اور عقیدے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مذہب اور عقیدے کی طویل اور پیچیدہ تاریخ کا مطالعہ اگر گہری نظر اور ٹھنڈے دل ودماغ کے ساتھ کیا جائے تو ہم بنی نوع انسان کی روح کو کھوج سکتے ہیں۔ انسان نے ایک طویل جدوجہد کی ہے۔ وہ فطرت کے مظاہر سے خوف زدہ بھی رہا ہے۔ ان سے لڑا بھی ہے اور ان پر فتح یاب بھی ہوا ہے۔ اس نے اپنے تحفظ کے لئے جتنی پناہ گاہیں بنائی ہیں اور جتنی مادی اور غیر مادی قوتیں زندگی کو آفات سے بچانے کے لئے پیدا کی ہیں ان میں سب سے زیادہ قوی پراثر اور دیرپا قوت عقیدہ ہی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان نے سب سے زیادہ قربانیاں "عقیدے" کے لئے دی ہیں۔ اگر یہ ڈور اس کے ہاتھ سے نکل جاتی تو وہ اپنے گردوپیش کی بے رحم طاقتوں کا شکار ہو گیا ہوتا اور آج زمین پر اس کا وجود ہوتا بھی تو اشرف المخلوقات کی صورت میں نہ ہوتا۔

اس لئے مذہب اور عقیدے کا مطالعہ نوع انسانی کی تنظیمی قوت اور بقاء کی جدوجہد میں اس کے ثبات واستقامت کا مطالعہ ہے۔ اس مطالعہ کے ضمن میں تاریخ، جغرافیہ، فلسفہ، فنون لطیفہ اور سائنس تک سب ہی شعبہ ہائے علوم سے مدد ملتی ہے۔ اس لئے کہ انسانی علوم کی کوئی شاخ ایسی نہیں ہے جس پر مذہب اثرانداز نہ ہوا ہو۔

مذاہب کی تاریخ کا مطالعہ تاریک زمانوں سے شروع ہوتا ہے۔ تاریخی شواہد نہ ہونے کی صورت میں رسوم وعقائد، طرزِ زندگی، عبادات اور معاملات کے گہرے تجزیاتی مطالعہ سے ہی نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں۔ اس لئے مذاہب کا مطالعہ بہت سے دوسرے موضوعات کے مطالعہ سے بہت مختلف ہو جاتا ہے۔ اس میں صحیح نتیجے تک پہونچنے کا دارومدار تجزیہ وتحلیل کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔

تقابلی مذہب (Comparative Religion) بحث وتحقیق کا ایک نیا موضوع ہے۔ اس صدی سے پہلے ہمارے علماء اس سے واقف نہیں تھے۔ ماضی میں مطالعہ مذہب کا رویہ بھی غیر جانبدارانہ نہیں تھا۔ عموماً اپنے ہی مذہب کا مطالعہ اور اس میں غور وفکر کرتے تھے یا اس کے مختلف فرقوں اور شاخوں کی تفصیل لکھتے تھے۔ دوسرے مذاہب کا ہمدردی سے مطالعہ کرنے کی روایت نہیں تھی۔ پھر بھی بعض مسلم علماء نے اپنے طور پر تقابلی مذہب کا مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم کتاب ابن الندیم (متوفی ۳۸۵ھ) کی الفہرست ہے جس کے مقالہ نہم میں ہندوستانی مذاہب کا حال لکھا گیا ہے۔ اس سے ہم چوتھی صدی ہجری کے ہندوستان کا حال جان سکتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ ہے جب مسلمان فاتحوں کے قدم اس سرزمین کے شمالی اور وسطی حصوں تک نہیں پہنچے تھے۔ ابن الندیم نے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے جو ۳ / محرم ۲۴۹ھ کو لکھی گئی تھی اس کا نام وہ ملل الہند وادیا فربا بتایا ہے۔ یعنی ہندوستانی قومیں اور ان کے مذاہب ۔ اس کتاب کے مصنف کا ہم معلوم نہیں ہوسکا لیکن اس میں کوئی عبارت یعقوب الکندمی کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

یہ ہندوستانی مذاہب پر کسی عرب اسکالر کی لکھی ہوئی قدیم ترین کتاب رہی ہوگی۔ عباسی

وزیر یحییٰ بن خالد برمکی نے کسی شخص کو ہندوستان بھیجا تھا کہ وہ دواؤں کے لئے کچھ جڑی بوٹیاں لے کر آئے۔ اس نے یہاں اپنی سیاحت کے زمانے میں ہندوستانی مذاہب سے بھی واقفیت حاصل کی۔ پھر یہ کتاب لکھی۔ ہندوستان کے بہت سے ویدوں اور پنڈتوں کو بھی تیسری صدی ہجری میں عباسی خلافت میں بلایا گیا تھا۔

ابن الندیم نے ہندوستان کے قدیم بت خانوں کا کچھ حال اسی کتاب میں لکھا ہے۔ وہ بدھ مت اور اس کی عبادت گاہوں کے بارے میں بھی ہمیں بتاتا ہے۔ اس کی یہ کتاب ۳۷۷ھ میں تیار ہو چکی تھی۔

دوسری عظیم شخصیت ابوریحان البیرونی کی ہے جو اپنے زمانے میں نابغۂ روزگار ہوا ہے وہ ۳۶۲ھ مطابق ۹۷۳ء میں پیدا ہوا اور ۴۴۲ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ البیرونی ہندوستان آیا۔ یہاں اس نے پنڈتوں کے ساتھ رہ کر ریاضی، جیوتش، فلسفہ، منطق وغیرہ علوم حاصل کئے اور تحقیق ماللہند جیسی بے مثل کتاب لکھی جس پر ہندوستانی فخر کر سکتے ہیں۔

گیتا کا عربی ترجمہ

البیرونی گیتا کا مداح ہے اس نے پہلی بار اس کتاب کے طویل اقتباسات کا عربی ترجمہ اپنی کتاب میں شامل کیا۔ وہ تیرہ سال ہندوستان میں رہا اور سنسکرت زبان میں مہارت حاصل کی۔ ہندوؤں کے مذہب، تہذیب و تمدن، رسوم و رواج اور عقائد و توہمات کا گہرا اور ہمدردانہ مطالعہ کر کے اس کے نتائج اس کتاب میں پیش کئے جسے ایڈورڈ زاخاؤ فکری اعتبار سے دنیا کی بلند پایہ کتابوں میں شمار کرتا ہے۔ البیرونی نے دراہامہرہ کی برہمت سمتا اور لاگھو جاتکم کے علاوہ پاتنجلی کا بھی عربی میں ترجمہ کیا۔ ہندوستان کے بارے میں البیرونی نے جو کچھ لکھا ہے اس کے مقابلے میں ہیون سانگ، میگاستھنیز اور ابن بطوطہ کی کتابیں بھی بچوں کے لئے لکھی ہوئی کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔

تقابلی مذہب میں تیسرا نام ابنِ حزم اندلسی کا لیا جاسکتا ہے جو ۹۹۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۵/اگست ۱۰۶۴ء کو وفات پاگیا۔ اس کے پردادا نے عیسائیت سے اسلام قبول کیا تھا۔ ابنِ حزم کی تصانیف میں کتاب الفصل فی الملل والاءھوا والنحل بھی ہے لیکن ہم اسے تقابلی مذہب کی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کتاب سخت لب ولہجہ میں لکھی گئی ہے۔ دوسرے مذاہب کے فکری اور فلسفیانہ تضادات کو ظاہر کرتی ہے اور اس کا انداز بھی مناظرانہ ہے۔ ابن حزم اپنی کاٹ اور سخت تنقید کے لئے مشہور ہی ہے۔ پھر اس نے تمام ادیان عالم سے بحث نہیں کی ہے بلکہ سامی مذاہب اور یونانی افکار کو زیر بحث لایا ہے اس کی یہ کتاب فرانسیسی اور ہسپانوی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوچکی ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ عبداللہ العمادی نے کیا تھا جو ۱۹۴۵ء میں تین جلدوں میں حیدرآباد کے دارالترجمہ سے چھپا تھا۔

تقابلی مذہب کے سلسلہ میں ایک اور نام محمد بن عبدالکریم شہرستانی کا ہے جو خرآسان کے قصبہ شہرستان میں ۴۶۹ھ میں پیدا ہوا اور ۵۴۸ھ / ۱۱۵۳ء میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے ۵۲۱ھ / ۱۱۲۷ء میں اپنی شہرہ آفاق کتاب الملل، النحل لکھی۔ اس نے یہ دیکھا ہے کہ کون سے مذاہب اسلام کے بنیادی عقائد سے ہٹے ہوئے ہیں اور کون سے اس سے قریب ہیں۔ اس نے اپنی کتاب میں پہلے اسلامی فرقوں کا حال لکھا ہے۔ پھر اہلِ کتاب یعنی عیسائی اور یہودی مذہب سے بحث کی ہے۔ تیسرے حصہ میں وہ مذاہب ہیں جن کی الہامی کتابیں مشکوک ہیں۔ وہ عہد قدیم کی مظاہر پرستی کے بعد یونانی حکماء کے فلسفوں پر بھی علحدہ علحدہ بحث کرتا ہے۔ اس مطالعہ میں اس کا رویہ اگر غیر جانب دارانہ نہیں تو اسے معاندانہ بھی نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن وہ ابنِ حزم کے مقابلے میں یقیناً نرم تنقید کرتا ہے۔

شہرستانی نے اپنی کتاب کے آخر میں ہندوستانی مذاہب سے بھی بحث کی ہے لیکن بدھ مت کے بارے میں زیادہ لکھا ہے۔ دوسرے مذاہب کی معلومات شاید اسے نہ مل سکی ہوں۔ ان سے وہ سرسری گذر جاتا ہے

ہندوستان میں بھی قدیم علماء نے اس موضوع پر کچھ کام کئے ہیں۔ ان میں ہم تین کتابوں کا خاص طور سے ذکر کر سکتے ہیں۔ ایک دبستانِ مذاہب جسے محسن فانی کشمیری سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن بعض محققین کا خیال ہے کہ یہ پارسی موبد کی تالیف ہے۔ دوسری کتاب دارا شکوہ کی مجمع البحرین ہے جس میں تصوف اسلامی اور ویدانت کا تقابل بڑے عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ تقابلی مذہب کے موضوع پر ہندوستان میں اس سے اچھی کتاب شاید ہی کوئی لکھی گئی ہو۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں محمد حسن قتیل کی "ہفت تماشا" بھی ہندوستانی مذاہب اور فرقوں کو سمجھنے کی ایک اچھی کوشش ہے۔ اس صدی میں تو بہت سے اعلیٰ درجے کے کام ہوئے ہیں جن میں ڈاکٹر تاراچند ایم این رائے اور پنڈت سندرلال کی کوششیں خاص طور پر قابلِ تعریف ہیں۔ تقابلی مذہب کے بارے میں چند بنیادی باتیں یاد رکھنا ضروری ہے۔ یہ اپنے مذہب اور عقیدے کے علاوہ کسی دوسرے مذہبی نظام کا معروضی مطالعہ ہے۔ اس کی پہلی شرط ہمدردی یا مفاہمت ہے۔ مناظرانہ اندازِ فکر سے تقابلی مذہب کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ہم کسی عقیدے کو صحیح اور کسی کو غلط سمجھتے ہیں اس سے تقابلی مطالعہ میں صحیح نتائج تک پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ ایک غیر جانبدارانہ تحقیق ہمیں خود ہی کسی نتیجہ تک پہونچادے۔ تقابلی مذہب کی دوسری بنیادی شرط کسی ایسی کلاسیکی زبان سے ماہرانہ واقفیت ہے جس میں اس مذہب کا فکری سرمایہ پایا جاتا ہو۔ اسلام کو ہم عربی سے واقف نہ ہونے کی صورت میں اچھی طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اسی طرح ویدک دھرم کو سنسکرت کے بغیر، بدھ مت کو پالی کے بغیر، یہودیت کو عبرانی جانے بغیر نہیں سمجھا جاسکتا۔ ہر مذہب کی کچھ بنیادی کتابیں ہوتی ہیں جن سے اصولِ مذہب کا علم حاصل ہوتا ہے۔ بعد میں علماء کی بحثیں، تاویلیں اور اختلافات کچھ کا کچھ کر دیتے ہیں۔ کسی مذہبی فکر کی صحیح واقفیت ان سب اختلافات سے دامن بچا کر ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔

انسان کی تہذیب ایک براکینوس ہے۔ مذہب اس کا ایک مظہر ہے۔ اسی طرح زبان بھی ۔ زبانیں بھی خاندانوں میں بٹ جاتی ہیں۔ اسی طرح تہذیبیں بھی قبایئل میں تقسیم ہوتی ہیں۔ عراقی تہذیب، مصری تہذیب، آریائی تہذیب، ایرانی، یونانی، رومی کیلٹی ٹیوٹانی، چینی، عربی، ساموی تہذیب، ان میں سے ہر ایک کی علحدہ تاریخ ہے، دائرہ اثر ہے، مظاہر ہیں اور نقطۂ عروج و زوال ہے۔ کسی مذہب کو سمجھنے کے لئے یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کس تہذیب کی آغوش میں پلا ہے اور اس تہذیب کا سفر کہاں سے شروع ہوا ہے۔ اس نے بنی نوع انسان کو کیا دیا ہے۔ دوسری تہذیبوں پر کہاں تک اثر ڈالا ہے۔ دوسروں سے کیا لیا ہے۔ ان کو کیا دیا ہے۔ افکار سے خوشہ چینی اور لین دین کا فطری عمل ازل سے جاری ہے اور ابد تک رہے گا۔